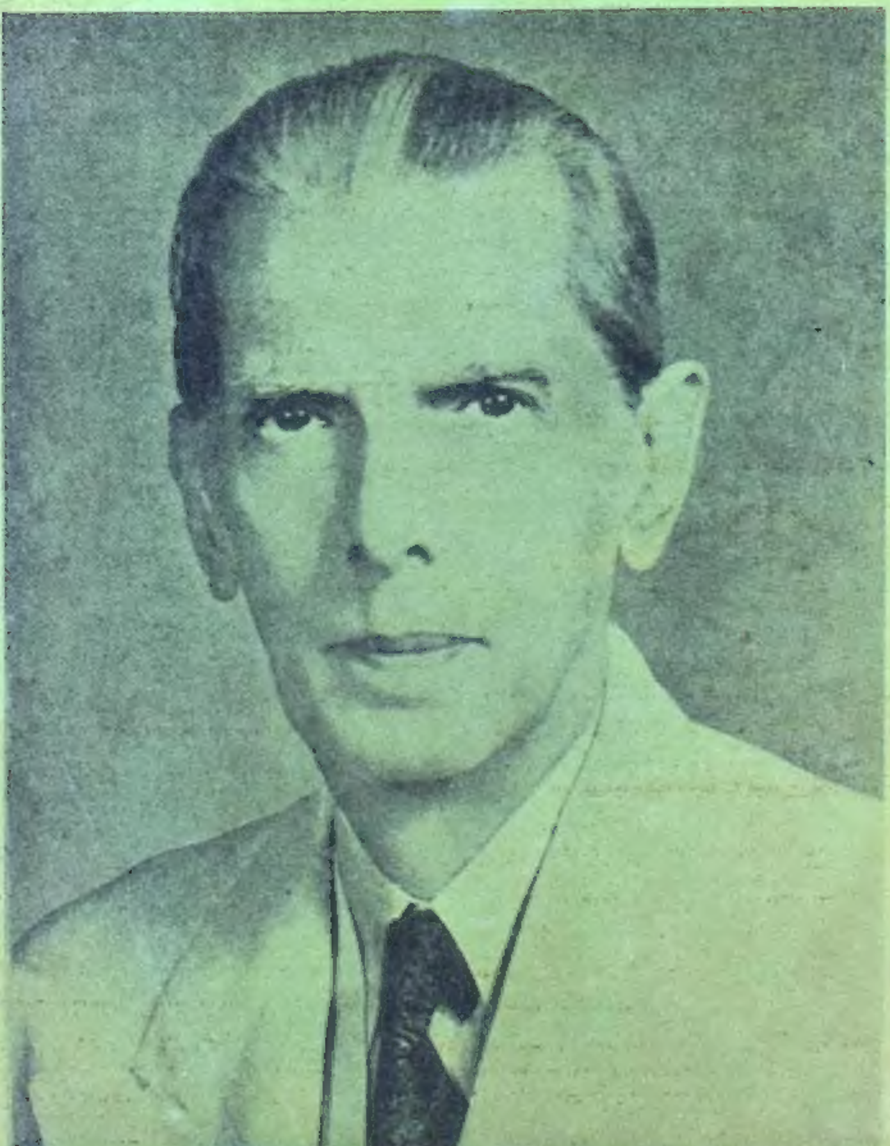
ماہنامہ

قومی زبان

انجمن ترقیٔ اردو کا ترجمان



انجمن ترقی اردو

اردو روڈ کراچی

انجمن ترقی اردو پاکستان کا ترجمان

ماہنامہ

قومی زبان

آزادی نمبر

جلد ۳۱ شمارہ ۲

اگست ۱۹۶۷ء

سالانہ قیمت
دس روپے

فی پرچہ
ایک روپیہ

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ
کراچی

فہرست

ادارۂ تحریر
جمیل الدین عالی
مشفق خواجہ

یومِ بابائے اردو

۱۶ اگست ۶۷ء کو بابائے اردو کی چھٹی برسی پر جناب اختر حسین کی صدارت میں ایک جلسۂ عام ہوگا جس میں جناب سید ہاشم رضا، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر وحید قریشی، جناب رئیس امروہوی، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، جناب سید محمد تقی، ڈاکٹر شوکت سبزواری، مولانا ماہر القادری، جناب حکیم محمد سعید، جناب سید محمد جعفری، جناب جمیل نقوی اور جناب جمیل الدین عالی اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں گے۔

یکم ستمبر کو "قومی زبان" کا عبدالحق نمبر شائع ہوگا۔ جس میں پروفیسر ہارون خان شیروانی، فضل احمد صدیقی، سید قدرت نقوی، حبیب اللہ رشدی اور دیگر اہل قلم کے مضامین ہوں گے۔ نیز بابائے اردو کی متعدد نادر تحریریں شائع کی جائیں گی۔

زیر تعمیر اردو کالج کے لئے عطیات

اب تک زیر تعمیر اردو کالج کے لئے مبلغ ایک لاکھ پچھتر ہزار اسی روپے تراسی پیسے (۱،۷۵،۰۸۰،۸۳) جمع ہو چکے ہیں۔ ذاتی طور پر عطیہ دینے والے اور رسائد کی فروخت سے رقم جمع کرانے والے حضرات اور اداروں کے نام مسلسل شائع کئے جا رہے ہیں۔ گزشتہ ایک ماہ میں جو عطیات وصول ہوئے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے:۔

عطیات:۔

۱:۔	یونائیٹڈ بنک کراچی	مبلغ ایک ہزار روپے
۲:۔	نیشنل کمرشیل بنک لمیٹڈ کراچی	مبلغ ایک ہزار روپے
۳:۔	جناب سید محمد طاہر صاحب۔ پری محل۔ شاہدرہ ٹاؤن۔ لاہور	مبلغ ایک سو روپے
۴:۔	ایم ایچ اسمٰعیل اینڈ کمپنی ۔ میریٹ روڈ۔ کراچی	مبلغ پچاس روپے

رسائد کی فروخت سے مندرجہ ذیل حضرات نے رقوم جمع کرائیں:۔

۱:۔	جناب ایس مطہر صاحب۔ ریجنل ٹرانسپورٹ اتھارٹی۔ کراچی۔	مبلغ پانچ ہزار روپے
۲:۔	لفٹننٹ کرنل ذوالفقار علی صاحب	مبلغ تین سو پچاس روپے
۳:۔	بیگم ونگ کمانڈر اکبر حسین صاحب	مبلغ تین سو روپے
۴:۔	محمد یونس خان صاحب	مبلغ تین سو روپے
۵:۔	جناب محمد خلیل اللہ صاحب۔ وائس پرنسپل اردو کالج۔ کراچی۔	مبلغ دو سو روپے
۶:۔	بیگم صادق علی صاحب	مبلغ پینتیس روپے
۷:۔	جناب محمد علی صاحب۔	مبلغ چونتیس روپے
۸:۔	جناب بیگم شیریں وہاب صاحبہ۔	مبلغ پچیس روپے
۹:۔	جناب سلیمان خان صاحب۔	مبلغ پانچ روپے

مولانا مظہر علی کامل

قیامِ پاکستان کا مقصدِ اولیٰ

۱۲ر جولائی ۱۹۴۷ء صبح ناشتہ سے فارغ ہو کر قائدِ اعظم نے مجھے اور نواب صدیق علی خاں صاحب کو یاد فرمایا نواب صاحب سے کچھ کاغذات اور خطوط کے متعلق گفتگو فرمائی اور مجھ سے آج کی مصروفیات کے متعلق دریافت فرمایا۔ جس کی تفصیل میں نے عرض کردی پھر اخبار دیکھنے میں مصروف ہو گئے۔

آج مسلم خواتین حیدر آباد کی جانب سے زمرد محل ٹاکیز میں قائدِ اعظم کی تشریف آوری کے سلسلے میں جلسہ تھا صبح نو بجے سے خواتین کی آمد شروع ہوئی۔ گیارہ بجے تک ہال کھچا کھچ بھر گیا۔ قلت گنجائش کی وجہ سے اکثر خواتین کو باہر ہی کھڑا رہنا پڑا۔ مملکتی مجلس اتحاد المسلمین کی جانب سے پردہ کے معقول انتظامات کئے گئے تھے۔ عابد روڈ پر قائدِ اعظم کو دیکھنے کے لئے دو رویہ عوام کا اجتماع تھا قائدِ اعظم ٹھیک گیارہ بجے تشریف لائے جلسہ گاہ کے اندرونی باب الداخلہ پر ارکانِ استقبالیہ نے قائدِ اعظم کو خوش آمدید کہا۔ ڈائس کو بڑی خوش اسلوبی سے آراستہ کیا گیا تھا۔ جلسہ گاہ میں قائدِ اعظم کی تشریف آوری کے ساتھ ہی طالبات و خواتین نے قائدِ اعظم زندہ باد اور پاکستان پائندہ باد کے پرجوش نعرے بلند کئے۔ بیگم شاہ جہاں صاحبہ صوفی نے قرأت کلام مجید سے جلسہ کا آغاز کیا۔ بیگم صاحبہ بہادر یار جنگ مرحوم، بیگم صاحبہ بابو خان صاحب، بیگم صاحبہ تجمل حسین صاحب کی طرف سے

قائدِ اعظم کو پھول پہنائے گئے اور قائدِ اعظم کی خدمت میں کیسہ ہائے زر پیش کئے گئے۔ طالبات نے خوش الحانی سے ترانۂ مسلم لیگ سنایا، بیگم صاحبہ ہمایوں مرزا نے خطبۂ استقبالیہ پڑھا جس میں تعلیم نسواں کی ضرورت اور اس کے انتظامات کی توسیع اور ملکی و معاشرتی اصلاح میں خواتین کی خدمات کی اہمیت اور ان امور کے لئے مناسب

مواقع فراہم کرنے پر زور دیا گیا تھا۔ اس کے بعد بیگم صاحبہ حفیظ و بیگم صاحبہ ڈاکٹر منور علی نے تقریریں کیں، جن میں قائد اعظم کی مخلصانہ خدمات کی تعریف اور آپ کی تشریف آوری پر مسرت ظاہر کی گئی۔ بشیر النسا بیگم صاحبہ بشیر نے اُردو میں اور لطیف النسا بیگم صاحبہ نے فارسی میں نظمیں سُنائیں۔ بیگم صاحب بہادر یار جنگ مرحوم نے پردہ سے سپاسنامہ پڑھا اور بھی کئی سپاسنامے پیش ہونے والے تھے۔ مگر قائد اعظم کی عدیم الفرصتی کی وجہ سے ان کی پیش کشی ملتوی کردی گئی۔ قائد اعظم نعروں کی گونج میں تقریر کے لئے کھڑے ہوئے۔ آپ کی تقریر کا خلاصہ یہ ہے :۔

"خواتین! میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے سپاسنامہ میرے سامنے پیش کیا اور مجھے عزت بخشی میں دیکھ رہا ہوں جیسا کہ ایک نظم میں کہا گیا ہے، ہم شان سے آگے بڑھ رہے ہیں اسی طرح میں دیکھ رہا ہوں کہ مسلم خواتین بھی شان سے آگے بڑھ رہی ہیں میں کئی دفعہ حیدرآباد آیا اب کی بار جب میں نے یہاں کا دورہ کیا تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ خواتین بہت ترقی کر گئی ہیں آپ کا یہ جلسہ پہلے کی بہ نسبت دگنا تگنا ہے اس سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ آپ میں کافی بیداری پیدا ہو گئی ہے۔ ہم حکومت کے لائق جب ہی ہوں گے جب کہ ہم میں مرد اور عورت دونوں کام کے لئے تیار ہو جائیں۔ مجھے آپ کے کام کرنے سے خوشی ہے بعض خواتین مجھ سے کہتی ہیں کہ ہم کیا کریں ہم کو مرد آگے بڑھنے نہیں دیتے۔ جب ہم نے مسلم لیگ کو قائم کیا اور کام شروع کیا تھا تو اسی طرح مشکلات پیدا ہو گئی تھیں خود ہمارے بھائی ہم کو آگے بڑھنے نہیں دیتے تھے۔ قائد اعظم نے فرمایا کہ مردوں کو سمجھاؤ کہ آپ کے دوش بدوش عورتوں کی بھی آپ کو ضرورت ہے آپ جو کام کر سکتی ہیں مرد نہیں کر سکتے دونوں مل کر بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ آپ میں بہت سی تعلیم یافتہ ہیں، سمجھدار ہیں، ہمارے آگے بہت سے مسائل ہیں پہلا کام آپ کا تعلیمی ہے اگر آپ تعلیم نہیں پائیں گی تو آپ کے بچے بھی اچھی تعلیم سے محروم رہیں گے جب آپ کو معلوم ہو گا کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے تو آپ کا بچہ بھی سمجھے گا یہ بات چھوٹی نہیں ہے بڑی اہم ہے۔ آپ کا دوسرا کام غریب ساتھیوں کی ہمدردی کا ہے آپ اس کے لئے کمیٹیاں بنائیے ان کی حالت بہتر کیجئے مہذب ملکوں میں ایسی کمیٹیاں بڑے بڑے کام کر جاتی ہیں اور قومی مشکلات کا حل نکال لیتی ہیں۔ مراکز بہبودی اطفال کی ضرورت ہے یہ کام آپ ہی سے نکلے گا ان کاموں کے لئے نہ صرف پیسوں کی بلکہ جان و مال کی قربانی سے بھی دریغ نہ کیجئے یہی اصول ہے جس سے آپ اپنی قوم کو مضبوط بنا سکتی ہیں۔ برٹش انڈیا میں ہماری جدوجہد جاری ہے اس کو آپ اخباروں میں دیکھ رہی ہوں گی۔ ہمارا مقصد اتنا ہی ہے کہ ہم کسی سے دب کر رہنا نہیں چاہتے بلکہ دنیا میں اپنا باآبرو مقام حاصل کرنا چاہتے ہیں اور یہ کام نہ صرف مردوں سے بلکہ آپ کی

مشترکہ جدوجہد سے ہوگا۔"

یہاں سے تقریباً بارہ بجے قائداعظم گسٹ ہاؤس (مہمان خانہ) واپس ہوئے۔ راستہ میں قائداعظم خواتین کے جلسہ کے انتظامات اوران کے نظم وضبط کی تعریف فرماتے رہے۔ آج آپ نماز جمعہ مکہ مسجد میں ادا فرمانے والے تھے۔ سوا بارہ بجے میں قائداعظم کو گسٹ ہاؤس سے لے کر روانہ ہوا۔ نواب صدیق علی خاں صاحب بھی ہمراہ تھے۔ ہم ٹھیک ساڑھے بارہ بجے مکہ مسجد پہنچے۔ مسجد غیر معمولی وسعت کے باوجود آج اپنی تنگ دامانی کا شکوہ کررہی تھی۔ مسلمانوں کا اجتماع مسجد کے باہر شاہ راہ عام پر چارمینار تک پہنچ گیا تھا۔ محکمہ امور مذہبی کی طرف سے مسجد میں غیر معمولی انتظامات عمل میں آئے تھے۔ صحن مسجد میں شامیانے نصب کئے گئے تھے۔ مسجد کے باب الداخلہ پر علما ومشائخین کی جانب سے مولانا سید پاشاہ حسینی صاحب معتمد مجلس علمائے دکن اور مولوی سید ولی اللہ حسینی صاحب افتخاری۔ مجلس اتحاد المسلمین کی طرف سے مولوی محمد یامین زبیری صاحب معتمد، مولوی سید محمود علی صاحب ہاشمی خازن معہ اراکین عاملہ۔ حکومت کی جانب سے نواب دین یار جنگ بہادر کوتوال بلدہ اور مولوی عبدالقیوم خاں صاحب ناظم محکمہ امور مذہبی (حال ڈسٹ سکریٹری جنرل حیدرآباد مقیم پاکستان) استقبال کے لئے موجود تھے۔

قائداعظم کے لیے صف اول میں منبر کے پاس جگہ مختص کی گئی تھی۔ آپ کے تشریف رکھنے کے بعد مکہ مسجد کے خطیب علامہ ابراہیم رشید مکی صاحب مرحوم نے عربی میں خطبہ شروع کیا۔ رشید صاحب مرحوم عربی النسل تھے زبان عربی پر اچھا عبور حاصل تھا بڑے اچھے انداز سے فی البدیہہ خطبہ دیتے تھے۔ اثنائے خطبہ میں رشید صاحب مرحوم نے قائداعظم کی اسلامی خدمات کو سراہا اور آپ کی کامیابی کی دعا کی۔ قائداعظم نے خطبہ میں اپنا نام سن کر مجھ سے دریافت فرمایا کہ خطیب صاحب کیا کہہ رہے ہیں میں نے اس کی وضاحت کی۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد مولانا سید بادشاہ حسینی صاحب کے ساتھ قائداعظم صحن مسجد کے منبر کے پاس تشریف لائے۔ جہاں مولوی سید صابر حسینی صاحب۔ مولوی شیخن احمد صاحب شطاری مولوی فرید بادشاہ صاحب، مولوی سید ولی اللہ حسینی صاحب اور دیگر علمار ومشائخین نے آپ کا استقبال کیا اور آپ کو منبر پر بٹھایا گیا۔ مولانا سید بادشاہ حسینی صاحب نے قائداعظم کو پھول پہنائے دیگر مشائخین کی جانب سے بھی پھول کے ہار پیش کئے گئے جن کو قائداعظم نے مولانا سید بادشاہ حسینی صاحب کے ہاتھ سے لے کر مجھے پہنایا۔ مولانا سید بادشاہ حسینی صاحب تقریر کے لئے کھڑے ہوئے۔ پہلے قائداعظم کی تشریف آوری پر اظہار مسرت کیا اور سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ۔

"یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اپنی قوت اور اپنے حقوق سے غافل و بے بہرہ مسلمانان ہند کو بیدار و متحد کرنے اور راہ عمل پر لگانے میں اس مرد مجاہد نے کیا کام انجام دئے ہیں جو کام کہ متعین کیا گیا ہے۔ اس کے حصول کے لئے ہمیں اس مجاہد قائد کا ساتھ دینا چاہئے کہ جن کی بے لوث قیادت پر ہم کو پورا اعتماد ہے۔ ہمارا خدا ایک اور قرآن ایک ہے تو یقیناً قیادت بھی ایک ہی ہونا چاہئے

تاکہ خلافت کا احیا ہو اور مسلمانوں کو خلیفہ نصیب ہو سکے۔ ہم قائداعظم کی کامیابی کے لئے ہر وقت دست بہ دُعا ہیں۔"

جواب میں قائدِ اعظم نے فرمایا۔

"برادرانِ اسلام! میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میری بڑی قدر افزائی کی ہمارے ہندوستان کے لئے یہ ایک نازک وقت ہے جہاں ہم پاکستان کے لئے ہر طرح سے کوشش کر رہے ہیں انشاء اللہ اس کو حاصل کر کے رہیں گے۔ مسلم لیگ میں اب وہ قوت آ گئی ہے جس کو کوئی قوت توڑ نہیں سکتی۔ علماء کی دُعا اور دس کروڑ مسلمانوں کی امداد سے ہماری کامیابی اٹل ہے۔ یہ تو پاکستان اور ہندوستان کی باتیں ہیں مگر حیدر آباد کی بات کچھ اور ہے اور صورت حال خوفناک ہے خدا کے لئے ایک رہو اگر تم ایک ہو جاؤ گے تو اقلیت میں ہونے کے باوجود تم کو تمہارے مقاصد سے کوئی روک نہیں سکتا۔"

آج مولوی سید تقی الدین صاحب مرحوم معتمد امور دستوری کے پاس قائداعظم ظہرانہ پر مدعو تھے کہ مسجد سے ہم بیر بن روانہ ہوئے جو قلعہ گولکنڈہ کے قریب ہے۔ یہیں مولوی سید تقی الدین صاحب مرحوم کا مکان تھا۔ نواب صدیق علی خاں صاحب بھی ظہرانہ میں مدعو اور ہمارے ساتھ تھے۔

راستہ میں قائداعظم نے خطبہ کے متعلق مجھ سے دریافت فرمایا کہ مسجد کے کثیر مجمع میں جہاں ہزاروں مسلمان جمع تھے کتنے ایسے مسلمان ہوں گے جنھوں نے خطیب صاحب کا عربی خطبہ سمجھا ہو؟ میں نے عرض کیا کہ سو سوا سو مسلمانوں نے سمجھا ہو گا۔ فرمایا اس سے خطبہ کا مقصد تو پورا نہیں ہوتا کیونکہ اُردو میں خطبہ دینے کے متعلق علماء میں اختلاف ہے۔ قائداعظم نے فرمایا کہ سمجھدار اور مسلمہ علماء کی ایک کانفرنس کیوں طلب نہیں کی جاتی جو خطبہ کے مقصد اور اس کے متعلقات پر متبدلہ حالات کو پیش نظر رکھ کر غور کرے اور اس مسئلہ کا تصفیہ کرے۔ میں نے کہا کہ ایسی کانفرنس کون طلب کرے؟ اس پر قائداعظم نے فرمایا کہ اسلام کا ہر عمل افادیت پر مبنی ہے بشرطیکہ ہم زمانہ اور قوم کے حالات کے لحاظ سے اس میں جزوی ترمیم کریں میں بنیادی تبدیلی کا قائل نہیں بلکہ یہ چاہتا ہوں کہ بعض اعمال میں ان کی اصلی روح اور ان کے بنیادی مقاصد کو باقی رکھتے ہوئے متبدلہ حالات کے لحاظ سے ایسی مناسب ترمیم کی جائے جس سے اس کی افادیت عام ہو جائے اور مسلمان اس کے مقصد کو سمجھیں اور مستفید ہوں فرمایا کہ اسی خطبہ کے مسئلہ پر غور کرو میں سمجھتا ہوں کہ جمعہ کے خطبہ کا مقصد یہ ہے کہ گذرے ہوئے ہفتہ کے حالات کا جائزہ لے کر اس پر تبصرہ کیا

جائے اور آئندہ ہفتہ کے لئے نظام العمل پیش کیا جائے۔ قوم کو بیدار کر کے۔ ان کی غلطیوں اور کمزوریوں سے ان کو واقف کرانے کا یہ کتنا آسان اور بہتر طریقہ ہے اگر صحیح طور سے ہم اس پر عمل کریں تو بہت جلد قوم میں ایک بڑا انقلاب بیدا کیا جاسکتا ہے پھر فرمایا کہ ہم پاکستان اسی لئے چاہتے ہیں کہ آزادی کے ساتھ اسلامی مسائل پر غور و فکر کر کے ان کو معقولیت کے ساتھ ایسے صحیح اور اچھے روپ میں پیش کریں جن میں جاذبیت و افادیت دونوں موجود ہوں تاکہ ہر مسلمان توجہ کرے اور آسانی کے ساتھ عمل کر کے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرے۔

اسی اثنا میں ہم مولوی سید تقی الدین صاحب مرحوم کے گھر پہنچ گئے اور سلسلۂ گفتگو ختم ہوگیا یہاں ظہرانہ میں مخصوص اصحاب مدعو تھے جن میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ نواب ذوالقدر جنگ مرحوم، مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی مرحوم (صدر شعبہ دینیات عثمانیہ یونیورسٹی) نواب معین نواز جنگ بہادر وزیر امور خارجہ حیدرآباد، نواب دین یار جنگ بہادر کوتوال بلدہ، مولوی رضی الدین صاحب معتمد محکمہ رسد، مولوی سید محی الدین صاحب وظیفہ یاب معتمد تعلیمات باباۓ اردو ڈاکٹر عبدالحق صاحب۔ مولوی سید واسع الہدی صاحب مرحوم تعلقدار، ڈاکٹر سید شافع الہدی صاحب واضع الہدی صاحب مرحوم مددگار محکمہ اطلاعات۔ مولوی آفتاب حسن صاحب مددگار ناظم تعلیمات حال ناظم شعبہ تالیف و ترجمہ کراچی یونی ورسٹی۔ دسترخوان پرتکلف اور مشرقی وضع کا تھا۔ چوکیوں پر کھانا چناگیا تھا کھانے بھی سب مشرقی تھے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد مولوی سید تقی الدین صاحب مرحوم کے بچے قائداعظم کو باذد کے برآمدے میں لے گئے جہاں ان بچوں نے قائداعظم کی گل پوشی اور مسلم لیگ کے لئے چندہ پیش کرنے کا انتظام کیا تھا۔ بچوں کی طرف سے مولانا سید مناظر احسن صاحب مرحوم نے قائداعظم کو پھول پہنائے اور مختصر سی تقریر کی آپ نے فرمایا۔

"قائداعظم! آپ دس کروڑ مسلمانان ہند کے قائد اور ان کی کشتی کے کھینے والے ہیں اس نازک دور میں سب آپ ہی کو اپنا سہارا سمجھتے ہیں اور آپ پر کامل اعتماد رکھتے ہیں۔ قائداعظم! جس قابلیت و دلسوزی سے آپ مسلمانوں کے حقوق کے لئے کوشش فرما رہے ہیں اس کی تعریف نہیں ہوسکتی ہم بارگاہ رب العزت میں دست بہ دعا ہیں کہ وہ آپ کو کامیابی عطا فرمائے اور مسلمانوں کا مستقبل بہتر بنائے۔"

جواب میں قائداعظم نے فرمایا۔

"مولانا! میں قائداعظم نہیں ہوں یہ درجہ بہت بڑا ہے آپ جانتے ہیں میں وکیل ہوں میرے پاس مختلف مقدمات آتے ہیں اور میں ان کی پیروی کرتا ہوں منجملہ ان مقدمات کے مسلم لیگ

کا بھی ایک مقدمہ میرے پاس ہے جس کی میں پیروی کر رہا ہوں ۔ میری حیثیت ایک وکیل کی ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں ۔ مجھے اللہ کے فضل اور آپ بزرگوں کی دعا پر بھروسہ ہے اور اس امر کا یقین ہے کہ ہم اس مقدمہ میں ضرور کامیابی حاصل کریں گے ۔"

قائداعظم کی اس مختصر تقریر نے مولانا پر عجیب رقت کی کیفیت طاری کر دی ۔ قائداعظم کا ہاتھ اپنے سر پر رکھ کر مولانا بے اختیار رونے لگے ۔ اس وقت قائداعظم مولانا کی پیٹھ تھپکتے ہوئے فرما رہے تھے "مولانا رونا نہیں ہمت ۔ ہمت ۔" یہاں سے واپسی میں قلعہ اور فوجی عمارتوں کے متعلق قائداعظم نے استفسار فرمایا میں نے وضاحت کی کہ یہی قلعہ گولکنڈہ ہے اور یہ عمارتیں حیدر آباد کنٹنجنٹ کے فرسٹ لانسر اور سکنڈ لانسر کی رہائشی عمارتیں ہیں ۔ اثناء راہ میں قائداعظم نے ایک اہم مسئلہ پر بڑی دل چسپ اور معنی خیز گفتگو فرمائی جو حقیقت میں ایک پیشین گوئی تھی جو سقوط حیدر آباد کے سلسلہ میں حرف بہ حرف پوری ہوئی ۔ پانچ بجے چائے نوشی کے بعد قائداعظم نے مولوی اشفاق احمد خاں صاحب اے ۔ ڈی ۔ سی ۔ مولوی عبدالکریم بابو خاں صاحب اور دیگر چند حضرات سے ملاقات کی پھر نواب صدیق علی خاں کو یاد فرمایا اور کچھ دیر ان سے گفتگو کی ۔ مغرب کے بعد ضروری کاغذات کے ملاحظہ میں مصروف رہے ۔

حکیم اسرار احمد

جنگِ آزادی میں اُردو کا حِصّہ

برِعظیم پاک و ہند میں مسلمانوں کی آمد حقیقت میں تاریخ عالم کے اس فکری انقلاب کا ایک درخشاں اور قابل ذکر باب ہے جو چودہ سو برس پہلے عرب کے بے آب وگیاہ صحرا سے اُٹھا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے زمین کے ایک بڑے حصے پر رحمت بن کر چھا گیا نبی امی روحی فدا ہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں جو سب سے بڑا معجزہ ظہور میں آیا وہ یہی تھا کہ آپ کے فیض صحبت اور حسن تربیت سے ان بادیہ نشینوں کو اقوام عالم کی رہبری اور سربراہی کا شرف حاصل ہوا۔ جن کا شمار کبھی اس وقت کی زندہ قوموں میں نہ تھا، اور جو تہذیب و تمدن کے مفہوم سے بھی ناآشنا خانہ بدوشوں کی سی زندگی بسر کر رہے تھے۔۔ ․․․․ اور اسی انقلاب کا ایک جھونکا جب سرزمین ہند کی طرف آیا۔ تو اس کی بھی کایا پلٹ گئی۔ اس بابرکت انقلاب کی روداد اور اس کے جو خوشگوار اہل ہند کی معاشرت، مذہب، سیاست اور خیالات پر پڑے اس کا حال ایک ہندو دانشور اور مفکر جسٹس رانا راڈے کی زبان سے سنئے:۔

> "علاوہ سرچشمہ قوت ہونے کے اسلامی حکومت نے سینکڑوں طریقوں سے ہندوؤں کے آداب و اطوار اور ذوق کے لطیف بنانے میں مدد دی۔ مسلمان حکومت کے فن کو پرانے ہندو حکمرانوں سے بہتر سمجھتے تھے۔ فن جنگ مسلمانوں کی آمد سے قبل نہایت ناقص تھا۔ بارود اور توپ و تفنگ کا استعمال ان کی بدولت رائج ہوا۔ بہت سی دستکاریوں اور صناعیوں میں وہ بقول بابر کے جدت و ایجاد کو کام میں لائے۔ ان کے نام اور ان کی اصطلاحیں جو غیر ہندی ہیں۔ بتاتی ہیں کہ ان کی اصل بدیسی ہے۔ انھوں نے شمع کاغذ، گھر کے ساز و سامان اور زین وغیرہ کو مرواج دیا۔ انھوں نے موسیقی (گانے بجانے) اور طب اور ہیئت کے علم میں بہت بڑا اضافہ کیا۔ ان کی تقلید میں ہندوؤں نے بھی ان دونوں علوم اور نجوم اور کیمیا میں اصلاح و ترقی کی اور مسلمانوں ہی کی بدولت جغرافیہ اور تاریخ پہلی بار علم و ادب کے شعبے قرار پائے۔ انھوں نے سڑکیں، پل، نہریں، کارواں سرائیں اور ڈاک خانے

بنائے ۔ اور فن تعمیر کے اعلیٰ نمونے پیش کئے ۔ فن باغبانی کو ترقی دی نیز ہمیں نئے پھلوں اور پھولوں سے آشنا کیا ۔ نظام مال گذاری جو اکبر نے زمانے میں ٹوڈر مل نے رائج کیا تھا ۔ موجودہ طریقہ مال گزاری کی بنیاد اسی پر ہے ۔ وہ تمام تجارت سمندر کے راستے دور دراز ملکوں سے کرتے تھے ۔ انھوں نے اہل ہند کے دل میں یہ احساس پیدا کیا کہ ہندوستان بھی آباد دنیا کا ایک حصہ ہے اور دوسرے ممالک سے تعلق رکھتا ہے اور معاشرتی لحاظ سے دوسروں سے منقطع نہیں ۔ ان تمام اعتبارات سے مسلمانوں اور ہندوؤں کی متحدہ قوتوں کا تمدن جس کے نمائندے دہلی کے مغل تھے ۔ ایسی نمایاں ترقی کا حامل تھا جس کا وجود میں آنا دسویں صدی عیسوی سے قبل ناممکن تھا ۔"

(خطباتِ عبدالحق ص ۱۵ تا ص ۱۸)

یہ تصویر کا وہ روشن رُخ ہے ، جس کا عکس قدیم باشندگان ہند پر پڑا ، لیکن اس کا تاریک پہلو بھی ہے ، جس کے بھیانک اثرات خود مسلمانوں کی زندگی پر مرتب ہوئے ۔ اس سے پہلے کہ ان مضر اثرات کا تجزیہ کیا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے دور اول کی تاریخ پر نظر ڈال لی جائے اور پھر اس پس منظر کے ساتھ کسی صحیح نتیجے پر پہنچنے میں آسانی ہو ۔

اسلام اپنے اصول عقائد ، عبادات اور معاملات کے اعتبار سے ایک ایسی انقلابی اجتماعیت کا مظہر ہے جو اپنے پیروؤں میں کسی امتیاز کو خواہ وہ نسلی ہوں ، لسانی یا تہذیبی روا نہیں رکھتا ۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے مبارک دور میں اسلام کی اجتماعی روح پوری طرح کارفرما تھی ۔ بنی امیہ کے عہد میں بھی ، اگرچہ وہ ملوکیت کا عہد تھا لیکن کسی نہ کسی حد تک اس کے اثرات باقی رہے ۔ البتہ بنی عباس کے برسر اقتدار آتے ہی جب معاملات مملکت میں عجمیوں کا اثر و نفوذ بڑھا تو ساری بساط ہی الٹ گئی ۔ اب مسلمانوں کی حکومت قدیم ایرانی شہنشاہیت کا ایک بے جان چربہ بن کر رہ گئی ، جو شان و شوکت اور ظاہری طمطراق کے اعتبار سے تو بلاشبہ اس عہد میں دنیا کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ حکومت تھی ، لیکن جہاں تک اسلام کی اجتماعیت کا تعلق ہے نہ صرف بنی عباس کی حکومت بلکہ مسلمانوں کی وہ ساری حکومتیں جو اس کی خاک سے اٹھیں سر تا سر غیر اسلامی حکومتیں تھیں ، چناں چہ برصغیر پاک و ہند میں بھی اگر محمد بن قاسمؒ اور اس کے جانشینوں کے مختصر دور حکومت کو نظر انداز کر دیا جائے تو مسلمانوں کی جتنی حکومتیں قائم ہوئیں ، آئین اور نظم مملکت دونوں حیثیتوں سے خالص عجمی حکومتیں تھیں اور ایرانی ملوکیت کی وارث تھیں ۔ ملوکیت اور جاگیردارانہ نظام میں کچھ خوبیاں بھی ہیں لیکن اس کی سب سے بڑی خرابی جو اس کی ساری خوبیوں پر پانی پھیر دیتی ہے یہ ہے کہ اس میں عوام کی جملہ خواہشوں اور کوششوں کا مرکز بادشاہ اور شاہی خاندان سے وابستہ ہوتا ہے اور یہ مرکز بادشاہوں کے عروج و زوال کے ساتھ وقتاً فوقتاً بدلتا رہتا ہے اور جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ۔ برعظیم میں ہزار سالہ کا ہزار سالہ دور حکومت اسی ملوکانہ اور جاگیردارانہ نقطۂ نظر کا آئینہ دار اور ترجمان ہے ۔ جس نے جسٹس رانا ڈے کے خیال کے مطابق اہلِ ملک کی معاشرت سیاست ،

مذہب اوران کے دیگر رجحانات اور احساسات کو بڑی عمدگی سے متاثر کیا۔ اور اس ملک میں ایک عظیم تہذیب وتمدن کی بنیاد ڈالی۔

> لیکن بدقسمتی سے ہندوستان کی برائے نام اسلامی حکومتوں کے یہ نمائندے اعلیٰ پائے کے حکمراں علوم وفنون کے سرپرست اور بے مثل تعمیری وتہذیبی صلاحیتوں سے متصف ہونے کے باوجود یا تو اسلام کی اجتماعی روح سے بے گانہ تھے یا موروثی اور ذاتی مفادات کے تحفظ کی خاطر انھوں نے اس اجتماعی روح کو دیدہ ودانستہ نظر انداز کیا۔ چنانچہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کا جائزہ لینے کے بعد یہ تکلیف دہ حقیقت ہمارے سامنے عریاں ہوجاتی ہے کہ ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں نے اگرچہ اس ملک کی کایا پلٹ دی، حکمرانی کے آئین سکھائے، علوم وفنون کو فروغ دیا، سڑکیں اور شاہراہیں بنائیں، بستیاں آباد کیں اور بڑی شاندار عمارتیں تعمیر کیں جو آج بھی زبان حال سے ان کی عظمت وجلال کی داستانیں سنا رہی ہیں لیکن وہ خود روشنی کے سرچشمے سے محروم ہوگئے..... انھوں نے دوسروں کی رہبری کی لیکن خود گم راہ ہوگئے۔

حقیقت میں اسلامی طاقت کا سرچشمہ اس کی اجتماعی روح ہے۔ جس کا مظہر مسلمانوں کا ملی شعور ہے اور یہی ملی شعور ان کے قومی شیرازے کو مربوط ومنظم رکھتا ہے۔ مسلمانان برعظیم پاک وہند کی تاریخ میں ہمیں ان کی بے مثل شجاعت، مافوق الفطرت کشورکشائی، اور غیر معمولی معارف پروری کی بیسیوں مثالیں ملتی ہیں، لیکن نہیں ملتی تو قربانی اور ایثار کی مثال۔ اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہزار سال کی اس مدت میں چند مستثنیات کو چھوڑ کر عوام میں ملی شعور کے مظاہر ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے، ان کی ساری سرگرمیاں ایک شاہی خاندان کو برسراقتدار رکھنے اور دوسرے خاندانوں کو بادشاہت کے سائے سے دور رکھنے تک محدود رہیں۔ انھوں نے مغلوں کی وفاداری کے نام پر بہادر پٹھانوں کے کس بل نکال دئے اور اس طرح ایک بادشاہ یا چند بادشاہوں کے مفاد کے لئے ہمیشہ ملت کے مصالح کو نظر انداز کیا۔

یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی ہے کہ اس دور میں بھول کر بھی، مسلمان بادشاہوں، مسلمان دانش وروں اور عام مسلمانوں نے اجتماعی طور پر ملت کے مفاد کو اپنی توجہات کا مرکز نہ بنایا۔ اور وہ صرف ذاتی سربلندیوں کے حصول کے لئے ایک ہزار سال تک باہم دست وگریباں رہے۔

انگریزی کی ایک مثل ہے کہ مستثنیات مسلمات کو ثابت کرتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہند میں مسلمانوں کے ہزار سالہ دور حکومت میں شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، نجیب الدولہ اور سلطان شہید ٹیپو جیسی غیر معمولی ہستیاں پیدا ہوئیں۔ یہی وہ چند قدسی نفوس ہیں جن کی نگاہیں ملت کے اجتماعی مفادات پر بھی

تھیں، اور انھوں نے کسی نہ کسی حد تک فکری اور عملی حیثیت سے مسلمانان ہند کی فلاح و بہبود کے لئے سلسلہ جنبانی کی لیکن افسوس کہ شخصی مفادات کے طوفان میں اسلام کی اجتماعی روح اور ملّی شعور کی شمعیں اچھی طرح روشن بھی نہ ہونے پائی تھیں کہ خاموش ہوگئیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اسلام بجائے خود ایک طاقت ور اجتماعی تحریک کا دوسرا نام ہے تو آخر کیا وجہ ہے کہ ہندوستان میں اس کے نام لیوا، اسلام کی اس حقیقی روح سے بے گانہ رہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ تو وہ عجمی اثرات ہیں جو بنی عباس کے عہد سے دنیائے اسلام پر مسلّط ہوئے۔ اور جو قدیم ایرانی ملوکیت کے پروردہ تھے۔ ظاہر ہے کہ ملوکیت میں اجتماعی مفاد کی گنجائش بہ مشکل ہی نکل سکتی ہے۔ دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ سندھ کی ابتدائی اسلامی حکومت سے قطع نظر، اس دور میں جتنی مسلمان بادشاہتیں برعظیم میں قائم ہوئیں ان کی سرکاری درباری زبان فارسی تھی یہ بڑی مہذب اور شائستہ زبان ہے، لیکن افسوس کہ اس عہد تک اس کا سرمایہ شعر و شاعری، تاریخ نویسی اور وقائع نگاری تک محدود تھا۔ علاوہ بریں وہ کسی زمانے میں بھی عام لوگوں کی زبان نہ تھی۔ اول تو اس زبان میں ان موضوعات اور مباحث پر کتابیں تھی ہی نہیں جو عوام کی فکر و نظر میں انقلاب پیدا کرسکتیں اور اگر کبھی کبھار ان موضوعات پر ایک دو کتابیں لکھی بھی گئیں تو مسلمان عوام اس لئے ان سے مستفید نہ ہوسکے کہ وہ ان کی دست رس سے باہر تھیں۔

اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ مسلمانان ہند میں قومی احساس اور ملّی شعور کی نشوونما اس وقت سے شروع ہوئی جب وہ مغلوں کی برائے نام حکومت سے بھی محروم ہوکر محکومی کے دور میں داخل ہوئے سرسید احمد خاں مرحوم نے اپنی تحریروں اور تقریروں سے ان کے ذہن و دماغ کو جھنجھوڑنا شروع کیا۔ حد ہوگئی کہ اس وقت تک قوم کا لفظ ذات کے معنوں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ اور اس سے مراد شیخ، سید، مغل اور پٹھان وغیرہ ہوتے تھے سید احمد خاں مرحوم نے سب سے پہلے لفظ قوم کو نیشن (NATION) کے معنوں میں استعمال کیا اور وہی پہلے شخص ہیں جنھوں نے مسلمانوں میں پہلی بار قومی مفاد اور قومی مصالح کا نعرہ بلند کیا اور اسلام کی اجتماعی روح کو عام مسلمانوں میں متعارف کرنے کے لئے تقریریں کیں۔ کتابیں لکھیں اور رسالے اور اخبار جاری کئے۔ انھوں نے اس کو عام روش کے خلاف عوامی بول چال کی سادہ زبان اُردو کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا۔

غرض کہ برعظیم پاک و ہند میں سرسید احمد خاں مسلمانوں کے ذہنی اور فکری انقلاب کے اولین داعی اور نقیب ہیں اور انھوں نے ہی اس مظلوم قوم کو جو مسلسل ایک ہزار سال سے شخصی مفادات کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھتی آرہی تھی، اجتماعیت۔ قومیت اور ملّی شعور کے مفہوم سے آشنا کیا اور یہ سارا کام انھوں نے اس زبان (اردو) سے لیا جسے اس

وقت ناشر فامنہ لگانا بھی عار سمجھتے تھے ۔ سرسید مرحوم جس طرح ہماری قوم کے سب سے بڑے محسن ہیں ، اسی طرح وہ ہماری قوم کے سب سے بڑے مدبّر بھی ہیں ..... چناں چہ انھوں نے اپنے مقدس مشن کو شروع کرنے سے پہلے ہی اچھی طرح محسوس کر لیا تھا اور حق الیقین اور عین الیقین کے درجے تک پہنچ گئے تھے کہ مردہ اور سوئی ہوئی قوم کو صرف اسی زبان کے ذریعہ زندہ اور بیدار کیا جا سکتا ہے ، جو اس کے معتقدات نظریات ، احساسات ، خیالات اور اعمال کی صحیح نمائندہ اور مظہر ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اردو کی اشاعت اور تحفظ کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیا کیوں کہ وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ وہ صرف اسی زبان کے ذریعہ اپنی بدبخت قوم کو ترقی اور سربلندی کی منزلوں تک کامیابی سے لے جا سکتے ہیں ۔ سرسید مرحوم بڑے روشن خیال ، وسیع المشرب اور رواداربزرگ تھے ۔ ایسے لوگ غیر اہم باتوں کی سے الجھنا اپنی شان اور وضع داری کے منافی تصور کرتے ہیں ۔ لیکن وہی سرسید اردو کے مسئلے پر برادران وطن سے اس طرح الجھے کہ مرتے دم تک صاف نہ ہوئے اور انھوں نے غیر مبہم لفظوں میں اعلان کر دیا کہ " برادران وطن کی اردو دشمنی کی وجہ سے اب اس ملک میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا مل جل کر رہنا ممکن نہیں رہ گیا ۔ ان کے اس فیصلے سے بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اردو کی اہمیت ان کی نگاہ میں کتنی تھی اور وہ اسے مسلمانوں کی ترقی ، تہذیب و تمدن کے لئے کس درجہ ناگزیر خیال کرتے تھے ۔

دورِ زوال کی یہ بھی ایک خصوصیت ہے کہ انسان کی ذہنی و فکری ترقی کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں ۔ اور وہ صرف اسلاف کی فرسودہ روایات ہی کے سہارے زندگی بسر کرنے کو اپنا مطمح نظر قرار دے لیتا ہے ۔ اسی کا دوسرا نام رجعت پرستی اور قدامت پسندی ہے ۔ اسی عادت بد کا نتیجہ ہے کہ انسان آگے دیکھنے کے بجائے ہمیشہ پیچھے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے ۔ قوم کے لئے یہ وقت بڑا نازک ہوتا ہے ، چناں چہ ہمارے مفکر شاعر علامہ اقبالؒ نے بھی اپنے اس شعر میں اسی طرف اشارہ کیا ہے ؎

آئین نو سے ڈرنا طرز کہن پہ اڑنا	منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

سرسید مرحوم کا ایک بڑا احسان یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنے فکر انگیز مقالات ، تالیفات اور تصانیف سے رجعت پرستی اور قدامت پسندی کے خلاف بڑا مضبوط محاذ قائم کیا ۔ کیونکہ جب تک پرانے توہمات و تعصبات کی دیواریں گرا نہ دی جائیں ، نئے خیالات و نظریات کے لئے گنجائش نہیں نکل سکتی ۔ اور جب تک نئے نظریات و خیالات سے بیداری پیدا نہ ہوگی ، قومی بیداری کے سارے منصوبے طاق پر دھرے رہ جائیں گے ۔ اس باب میں سرسید مرحوم کی اردو تحریروں اور تقریروں سے مسلمان قوم کے ذہن و دماغ پر جو غیر معمولی اور دیرپا اثرات چھوڑے ہیں اس کا فیض اب تک جاری ہے اور بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ خطۂ زمین کے اس حصّے کے مسلمانوں میں آج جو بیداری نظر آ رہی ہے ۔ اس کی خشت اول سرسید مرحوم نے ہی رکھی تھی اور اس لحاظ سے قوم اور ان کے گوناگوں

احسانات سے کبھی عہدہ برا نہیں ہو سکتی۔ لیکن ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ اگر ان کے خیالات کی اشاعت کا ذریعہ اردو جیسی عام فہم، سادہ نگرجات دار زبان نہ ہوتی تو نتائج اتنے شاندار اور حیران کن نہ ہوتے کہ وہی قوم جو زوال و پستی کی آخری حدوں سے بھی تجاوز کر گئی تھی۔ صرف نوے سال کے اندر برعظیم میں اپنے لئے ایک آزاد مملکت کے قیام پر کامیاب ہو جاتی۔ اور مزید یہ کہ اب اس کا مطمح نظر جیسا کہ ماضی میں تھا، شخصی مصالح اور مخصوص و محدود مفادات کا تحفظ و استحکام نہیں بلکہ اب اس کا نقطۂ نظر اجتماعی طور پر ملک و ملت کا نفع و نقصان ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایک ہزار سال تک مسلمان فکر و نظر کے جس مثالی نصب العین کے مفہوم سے بھی ناآشنا رہے۔ ایک سو سال کے دور محکومی میں کس طرح اس دولت سے سرفراز ہوئے۔

سرسیدؒ کے رفقائے کار میں مولانا حالی مرحوم کا درجہ اس اعتبار سے بہت بلند ہے کہ انھوں نے سرسید کے مشن کو اچھی طرح سمجھا اور پھر اپنے مسدس کے ذریعہ اس کی تبلیغ و اشاعت کا مقدس فرض انجام دیا۔

> مولانا کے مسدس نے قوم کے دل و دماغ کو جس طرح متاثر کیا۔ یہ اسی کا طفیل ہے کہ مسلمانوں میں "احتساب خویش" کا جذبہ محمود پیدا ہوا۔ دوسروں کے عیوب دیکھنے کے بجائے اب ان کی نگاہیں اپنے عیبوں کی طرف اٹھیں اور انھوں نے سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا کہ ان کی پستی و پس ماندگی تقدیر خداوندی کا نتیجہ ہے یا ان کے اپنے اعمال کا ثمرہ۔

دنیا میں بہت سی زبانیں ہیں اور ان کا ادبی سرمایہ بھی قابل رشک ہے۔ لیکن ان میں مسدس حالی کے درجے کی کوئی انقلابی نظم موجود نہیں ہے۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ جب یہ مسدس شائع ہوا تو کیا عالم کیا عامی سب اس کی مخالفت میں صف آرا ہو گئے۔ لیکن جذبات کی شدت کم ہونے کے ساتھ ہی سب نے اس کے مضمرات پر غور کرنا شروع کیا۔ اور عالم فاضل تاجر، مزدور، امیر، غریب، استاد اور طالب علم سب بقدر ظرف اس سے اثر پذیر ہونے پر مجبور ہوئے۔ یہ کہنا خلاف واقعہ نہ ہوگا کہ مسلمانان برعظیم کے رجحانات و خیالات کی تعمیر و تشکیل میں جتنا حصہ مسدس حالی کا ہے اتنا اس زبان کے کسی بڑے سے بڑے علمی و ادبی شاہکار کا نہیں۔ مولانا جلال الدین رومیؒ کی مثنوی کو فارسی زبان کے قرآن سے تشبیہ دی جاتی ہے لیکن گستاخی معاف ان معنوں میں اردو کے "مسدس حالی" کا مرتبہ بھی مثنوی سے کم نہیں، بلکہ بعض حیثیتوں سے اس نے ہندوستانی مسلمانوں کے دل و دماغ کو اس سے کہیں زیادہ متاثر کیا ہے، جتنا کہ مولانا روم کی مثنوی کا اثر فارسی داں افراد پر پڑا ہے۔

غرض کہ سرسید مرحوم نے مسلمانان ہند کی بیداری کی جس پاکیزہ مہم کا آغاز کیا تھا اور جو ان کی زندگی ہی میں ایک طاقتور تحریک کی حیثیت سے اسلامی معاشرے میں پھیل گئی تھی۔ اسے مولانا حالی کے مسدس سے بڑی تقویت پہنچی اور

مسلمانوں میں زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی۔ مسدّس نے مسلمانوں کی فکری سمتوں کے تعیّن میں جو غیر معمولی حصہ لیا ہے اسی کا اثر ہے کہ ان کے سارے مسائل کے تصفیے میں خواہ وہ تعلیمی ہوں، معاشرتی یا سیاسی اس کے روح پرور نغموں کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔

سرسید اور حالی نے جس فکری انقلاب کی صورت نکالی، آخری دور میں علامہ اقبال مرحوم نے اس میں بین اسلامی تصورات کا اضافہ کیا۔

> سرسید کے طفیل قوم نیند سے بیدار ہو چکی تھی۔ اور مولانا حالی کی بدولت وہ اپنے مرض کی تشخیص کر چکی تھی اور اب اس کی ضرورت تھی کہ کوئی "دانائے راز" اسے عمل اور جدوجہد کے اسرار ورموز سے آگاہ کرے، چناں چہ اس عالم میں اقبال نے اپنا نغمہ بلند کیا۔ اور اس شان سے کہ تھکا ماندہ لیکن عہد حاضر کے تقاضوں سے آشنا قافلہ منزل مقصود کی طرف گام زن ہوگیا۔ اور پہلے پہل اسکے دل میں اپنے موقف کا احساس بیدار ہوا۔
>
> سرسیّد کی تحریروں، حالی کے مسدّس اور اقبال کے نغموں نے صرف اس لئے قوم کے دل ودماغ کو متاثر کیا، اور ان کے اجتماعی وملّی شعور کو بیدار کیا جو حقیقت میں ترقی کا پہلا زینہ ہے کہ قوم کے ان محسنوں نے اردو زبان کو اظہار وبیان اور اپنے خیالات کی تبلیغ و اشاعت کا ذریعہ بنایا جو برعظیم کے سارے مسلمانوں کی مشترک زبان تھی۔ اور جو کشمیر سے راس کماری تک اور خلیج بنگال سے درّہ خیبر تک مسلمانوں کی آرزوؤں تمناؤں اور عزائم کا مظہر تھی۔

اگر ۱۸۵۷ء کے بعد سے مسلمانان برعظیم کی قومی وسیاسی تحریکوں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ اردو ہی تھی۔ جس نے قومی زندگی کے ہر موڑ پر ان کی صحیح رہبری کی، انھیں عزم وحوصلہ دیا اور کام یابی سے ہمکنار کیا۔ وہ کام جو مسلمان بادشاہ اپنے ہزار سالہ دورِ حکومت میں نہ کر سکے تھے، وہ اس نے کر دیا۔ ان میں وحدت خیال وعمل پیدا کی اور مشترک مقصد کے لئے مل کر کام کرنے کا گر سکھایا۔ انھیں اسلام کی اجتماعی روح سے آشنا کیا اور ہزار سال کے خوابیدہ ملی شعور کو بیدار کیا۔ یہ اردو ہی کا احسان ہے کہ اس نے مسلمانانِ ہند کو وطنیت علاقائیت اور خطہ جاتی تعصبات کے دلدل میں پھنسنے نہ دیا۔ ان کے احساسات کو ملّی اور قومی مفادات کے زیر اثر رکھا، چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب یورپ کی بڑی طاقتوں نے قدیم ترکی خلافت کو پارہ پارہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اور یورپ کے مرد بیمار کو بلقان اور طرابلس کی لڑائیوں میں الجھا کر اس کے نام ونشان کو مٹانا چاہا تو ہندوستان کے

مسلمان تڑپ اٹھے ۔ اسلامی اخوت کا یہ احساس مسلمانوں میں کس نے پیدا کیا ۔ اردو اخباروں اور اردو رسالوں نے اردو انشاپردازوں اور سیاست دانوں نے جن کی ذہنی اور دماغی نشو و نما اردو تہذیب و ثقافت کے زیر اثر ہوئی تھی ۔ خلافت کمیٹی، مسلم لیگ، مجلس احرار، خدائی خدمت گار، خاکسار اور جمعیتہ علمائے ہند کی تحریکیں اسی اردو زبان کے سہارے پروان چڑھیں ۔ خصوصاً ۱۹۳۶ء کے بعد مسلم لیگ کی تحریک کو از سر نو زندہ و سرسبز کرنے میں اس کا جو حصہ ہے پچھلے واقعات اس کی زبردست شہادت دے رہے ہیں ۔ آخر میں پاکستان کا پیغام اسی زبان نے گھر گھر پہنچایا ۔ تقسیم سے پہلے ملک میں جو عام انتخابات ہوئے اور مسلم لیگ کو ان میں جو عدیم النظیر کامیابی حاصل ہوئی ۔ وہ بھی بڑی حد تک اردو زبان ہی کا صدقہ تھی ۔ ہزاروں رضاکاروں اور کارکنوں نے ملک کے گوشے گوشے میں پھر کر اردو زبان ہی کے ذریعہ مسلمانوں کو پاکستان کے پیغام سے روشناس کیا اور اردو روزناموں نے زور دار مقالات اور مضامین شائع کر کے پاکستان کے موقف کو تقویت پہنچائی ۔

سچ تو یہ ہے کہ مسلمانوں میں اجتماعی روح پیدا کرنے اور ان کے ملی شعور کو بیدار کرنے اور ۱۸۵۷ء کی تباہی و بربادی کے بعد ان کے مردہ دلوں کو حیات نو کی حرارت سے آشنا کرنے میں اردو زبان نے جو اہم کردار ادا کیا ہے، بدقسمتی سے اس کا صحیح اندازہ اب بھی بہت کم لوگوں کو ہے ۔ حقیقت میں یہ زبان مسلمانانِ برعظیم کی حیات اجتماعی کا مظہر اور ایک ایسا مجلیٰ و مصفّا آئینہ ہے جس میں ان کی قومی زندگی کے خط و خال اور نازک سے نازک نقوش پوری آب و تاب سے جلوہ گر نظر آتے ہیں ۔ یہی وہ زبان ہے جس نے مسلمانانِ برعظیم کی ساری قومی تحریکوں اور اجتماعی کوششوں کو پروان چڑھایا اور پاکستان کی جدوجہد کو کم سے کم عرصے میں کامیابی اور کامرانی سے ہم کنار کیا ۔

> قصہ مختصر یہ زبان نہ صرف مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کا مخزن ۔ ان کے علوم و فنون کا سرچشمہ اور ان کی مادی و روحانی ترقیوں کا وسیلہ ہے بلکہ یہاں کی حیات قومی و اجتماعی کے لئے بمنزلہ شہ رگ کے ہے جس کے بغیر ان کی بیداری کا تصور بھی بمشکل کیا جا سکتا تھا ۔ عربی زبان کے بعد جس زبان نے مسلمانوں کے خیالات و احساسات کو سب سے زیادہ متاثر کیا وہ یہی زبان اردو ہے اور جس کی قوت و صلاحیت سے متاثر ہو کر ہی قائد اعظم محمد علی جناح نے ڈھاکہ میں یہ اعلان فرمایا تھا کہ " پاکستان کی قومی زبان اردو اور صرف اردو ہو گی "

لیکن افسوس کہ قائد اعظم کے وصال کے بعد جہاں ہماری اور بہت سی قومی قدریں پامال ہوئیں اردو کی مسلمہ حیثیت اور اہمیت کو بھی شدید صدمہ پہنچا ؎

ہر کس از جورِ غیر نالہ کند　　　　سعدی از دست خویشتن فریاد

میاں بشیر احمد

اسلامی ہند کی بیداری

ہندوستان میں اسلامی حکومت اگرچہ کہنے کو اورنگ زیب کی وفات ۱۷۰۷ء کے ڈیڑھ سو سال بعد تک قائم رہی دراصل حکومت اور امراء دونوں کی عظمت و سطوت اٹھارہویں صدی کے وسط تک ختم ہو چکی تھی۔ انیسویں صدی کے شروع میں مسلمانوں کے سیاسی تنزّل کی تکمیل ہوئی۔ چنانچہ ۱۸۰۳ء میں انگریز دہلی میں داخل ہوئے لیکن اسی زمانہ میں ان کے بعض افراد کے دل میں مذہبی احیاء اور معاشرتی اصلاح کا خیال پیدا ہوا۔ شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز وغیرہ کی کوششوں سے علم دوست لوگوں میں مذہب کی صحیح واقفیت بڑھ گئی لیکن عوام کی مذہبی حالت بہت گری ہوئی تھی اور مذموم معاشرتی رسموں میں مسلمانوں اور ہندوؤں میں کوئی زیادہ فرق نہ تھا۔

سیاسی تنزل اور معاشری تخریب کے اس دور میں ایک پرخلوص مصلح سید احمد بریلوی پیدا ہوئے۔ جنھوں نے وہابی عقائد سے متاثر ہو کر ۱۸۱۶ء سے ۱۸۳۱ء تک پندرہ سال مسلمانوں کی مذہبی و معاشری خرابیوں کو دور کرنے کی پوری کوشش کی۔ اس سلسلے میں مذہبی آزادی کے حصول کے لئے انھوں نے دسمبر ۱۸۲۶ء میں سکھوں کے خلاف مذہبی جہاد کی مہم شروع کی، جس کے دوران سات ہزار مجاہدین نے پشاور کے قریب میدان جنگ میں نمایاں کامیابی حاصل کی، اور سید احمد نے ایک نظام حکومت قائم کر کے قبائل کی معاشرتی اصلاح کے احکام نافذ کئے۔ لیکن بعض افغانوں کی غداری سے جو سکھوں کے ساتھ شریک ہو گئے۔ آخرکار مسلمانوں کو شکست ہوئی اور ان کا رہنما ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو بالاکوٹ میں شہید ہوا یعنی مسلمانوں کی مساعی خود مسلمانوں ہی کے ہاتھوں برباد ہو گئیں۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ سید احمد بریلوی نے پہلی بار ہندوستاں کے مسلمانوں کو دوسری قوموں کے مقابلے میں جمع کیا۔ اور ان کے اصلاحی کاموں کو ان کے بعض جانشینوں نے جاری رکھا۔ سرسیّد کئی باتوں میں اپنے ہم نام کے ہم خیال تھے۔ اور ان کے عقیدت مند تھے۔ اس زمانے میں بہار میں مسلمانوں میں فرائضی تحریک اٹھی، جس کا مقصد غریب مسلمانوں اور خصوصاً مومنوں کی ناگفتہ بہ حالت کی اصلاح اور ان کی امداد تھا۔

۱۸۵۷ء میں غدر ہوا۔ مسلمانوں کی رہی سہی عزت خاک میں مل گئی، انگریزی حکومت سو سال سے ان کی ذلت کے

درپے تھی۔ بتدریج مسلمانوں کی زمینیں اور عہدے چھین لئے گئے۔ اسلامی تعلیم کے ذرائع ختم کر دیے گئے۔ ۱۸۳۷ء میں فارسی زبان عدالتوں سے خارج کر دی گئی۔ غدر کے بعد ان پر عتاب اور بڑھتا گیا۔ اس طرح مسلمان پسپا بھی ہوئے، انگریزوں کے مظالم سے متاثر ہو کر نئی حکومت اور اس کے ارادوں سے بیزار بھی ہوتے گئے۔ ادھر ہندوؤں کی بے رخی نے ان کے زخموں پر اور بھی نمک چھڑکا۔ اس ناگفتہ بہ حالت میں ایک دور اندیش ہمدرد ملت اٹھا جس نے اپنی مایوس پسماندہ قوم کو امید محنت اور ترقی کا زندگی بخش پیغام دیا۔ یہ مرد خدا سرسید احمد خاں تھا یہ انھیں کی جد و جہد کا نتیجہ تھا کہ گو ملک ہاتھوں سے گیا۔ ملت کی آنکھیں کھل گئیں۔"

سرسید نے قدامت پسند مسلمانوں کو نئے زمانے کی ضروریات سے آگاہ کیا۔ اور ہزار دقتوں سے ان کو نئے علوم کے حصول اور نئی حکومت سے تعاون پر آمادہ کیا۔ اپنی مذہبی تصانیف اور رسالہ تہذیب الاخلاق کے اجرا سے انھوں نے ثابت کر دیا کہ اسلام عقل کے اصولوں پر مبنی ہے۔ ان کی تعلیمی مساعی ۱۸۷۷ء میں تکمیل کو پہنچیں۔ جب علی گڑھ کالج کا افتتاح ہوا جو کم از کم تیس برس تک مسلمانانِ ہند کا واحد قومی مرکز بنا رہا ۱۸۸۴ء میں سرسید نے پنجاب کا دورہ کیا۔ جہاں زندہ دلانِ پنجاب کی قدر دانی سے ان کو بڑی تقویت پہنچی۔ پنجاب کے مسلمان سرسید کی منادی پر اس طرح دوڑے۔ جس طرح پیاسا پانی پر دوڑتا ہے۔ ایک طرف وہ علی گڑھ سے وابستہ ہوئے دوسری طرف انھوں نے لاہور میں انجمن حمایتِ اسلام کا ادارہ قائم کیا۔

۱۸۸۶ء ۱۸۸۴ء میں سرسید نے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی۔ جس کے اجلاس ہر سال مختلف مقامات پر منعقد ہو کر مسلمانوں میں ایک نئی زندگی پھونکنے کا باعث ہوئے ۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اردو موقوف کر کے ملک میں بھاشا زبان جاری کی جائے۔ سرسید کہتے ہیں کہ یہ پہلا موقع ہے کہ جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ ساتھ چلنا محال ہے اور دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔

۱۸۸۴ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد پڑی۔ سرسید نے مسلمانوں کو اس میں شرکت کرنے سے منع کیا کیوں کہ ان کی دور اندیش نگاہ نے دیکھ لیا کہ اس سے مسلمانوں کو بحیثیت قوم کے نقصان پہنچے گا۔ اپنے ایک اہم بیان میں انھوں نے کہا کہ جمہوری سوراخ پیدا کر لیتے ہیں کہ خود زمین کے اندر غائب ہو جائیں۔ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ پورے کا پورا دریا کہاں چلا گیا۔ اور کیوں زمین کے اندر اندر دریا کا پانی کہیں کا کہیں پہنچ جاتا ہے اور پھر کس مقام پر ظاہر ہوتا ہے یہ طریقہ ہندوستان کے لئے موزوں نہیں۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ سرسید کے پیش نظر انگریزوں کی خوشنودی نہ تھی بلکہ اپنی قوم کی ترقی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ پہلے ہندوستانی تھے۔ جنھوں نے غدر کے بعد ۱۸۸۹ء میں اپنی مشہور تصنیف اسباب بغاوت ہند لکھ کر حکومت کو توجہ دلائی کہ غدر کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ ہندوستانیوں کو ملک کی سیاسی

کونسلوں میں شامل نہیں کیا گیا۔ پھر ۱۸۷۸ء میں جب وہ کونسل کے ممبر نامزد ہوئے۔ تو انھوں نے ملکی و قومی مفاد پر پے در پے تقریریں کیں ۱۸۹۸ء میں جب سرسید احمد نے انتقال کیا تو ان کی قوم اپنے خواب گراں سے جاگ چکی تھی۔

سرسید کے بعد ان کے رفقا نے ان کا شاندار کام جاری رکھا۔ محسن الملک، حالی، نذیر احمد، ذکاء اللہ، شبلی وغیرہ نے تعلیمی، سیاسی اور ادبی خدمات سرانجام دیں۔ محسن الملک نے علی گڑھ کالج کو ترقی دی۔ وقار الملک ایک سیاسی جماعت کی تشکیل میں معاون ہوئے۔ حالی کے مسدس نے ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی میں انقلاب کی لہر دوڑا دی۔ شبلی نے اسلامی تاریخ کے آئینے میں انھیں اپنی گزشتہ عظمت دکھا کر ان کے دلوں کو گرما دیا۔ امیر علی نے اپنی انگریزی تصانیف سے مغربی حلقوں میں اسلام کی وقعت پیدا کی۔

غرض مسلمانان ہند کی جدید سیاسی زندگی کی داستان یہ ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس کے بعد سرسید نے علی گڑھ میں مسلمانوں کے سیاسی حقوق کے تحفظ کے لئے قدم اٹھایا۔ لیکن بالعموم ان کی قومی سیاست یہ ہی تھی کہ مسلمان ملکی سیاست سے الگ تھلگ رہیں۔ اور پہلے مغربی علوم کے حصول سے اپنی قوم کی حالت کو درست اور مضبوط کرلیں۔ مگر بیسویں صدی کے شروع سے ایشیا اور اس کے ساتھ ہندوستان میں صورت حال دگرگوں ہونے لگی۔ جاپان کی فتح سے ہندوؤں میں جذبۂ قومیت ابھرا اور انھوں نے تقسیم بنگال کے خلاف ۱۹۰۵ء میں ایک زبردست تحریک شروع کی۔

علاوہ بریں اردو ہندی کے جھگڑے کے سلسلے میں یو پی کی حکومت نے علی گڑھ کے تعلیمی ادارے کو اس نیم سیاسی مسئلے میں دخل دینے سے حکماً روک دیا۔ جس کی وجہ سے مسلمانوں کے لئے اور بھی ضروری ہوگیا کہ وہ اپنے تمدنی و سیاسی حقوق کی حفاظت کے لئے ایک سیاسی جماعت کی بنیاد رکھیں۔

(دسمبر ۱۹۰۶ء میں) مسلم لیگ قائم ہوئی اور ۱۹۰۹ء کی اصلاحات میں مسلمانوں نے جداگانہ انتخابات کا اہم حق حاصل کیا پھر بنگال کی تنسیخ ۱۹۱۱ء اور جنگ بلقان و طرابلس ۱۲-۱۹۱۱ سے جب مسلمانوں کو یقین ہوگیا کہ ان کے قومی اور بین الاقوامی حقوق حکومت برطانیہ کے ہاتھ میں محفوظ نہیں رہ سکتے تو انھوں نے ہندوستان کے لئے سلف گورنمنٹ کا مطالبہ کیا اور کانگریس کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھایا۔ جنگ عظیم نے ہندوستانیوں کے دلوں میں حرکت پیدا کی۔ کانگریس اور لیگ میں میثاق لکھنؤ کا مشہور معاہدہ ہوا جس کی وجہ سے برطانیہ ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء کو یہ اعلان کرنے پر مجبور ہوگیا کہ ہندوستان کو بتدریج خود مختار حکومت دی جائے گی لیکن جنگ ختم ہوتے ہی برطانیہ حکومت نے ہندوستانیوں سے طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں۔ اور ظالمانہ قوانین نافذ کرنے کی ٹھان لی۔

اور ——— خالق عظیم و برتر کی لامحدود عنایات و برکات کے طفیل آج دنیا کے نقشے پر مملکت خداداد پاکستان کا وجود قائم ہے۔ نہ صرف قائم ہے بلکہ اس اسلامی مملکت کا پرچم دس کروڑ مسلمانوں کی عظمت و شوکت کا نشان بن کر فضا کی وسعتوں میں لہرا رہا ہے۔ اور اس پرچم کے حیات بخش سائے میں ملک کے باشندے قومی تعمیر و ارتقاء کی

منزلوں کی طرف رواں دواں ہیں۔ اس ملک کے بانی حضرت قائداعظم محمد علی جناح کی ہمہ گیر اور منفرد شخصیت سے کون آشنا نہیں۔ اس عالم آب و خاک میں جب تک یہ خطۂ پاک قائم ہے۔ قائد اعظم کا نام و مقام زندہ رہے گا اور حادثات زمانہ کا بڑے سے بڑا طوفان بھی اس عظمت کے آفتاب کی روشنی کو کم نہیں کر سکتا۔ ملت کا یہ آفتاب عظیم اگرچہ ظاہری طور پر غروب ہو چکا ہے لیکن اس کی لازوال شعاعوں سے ارض پاک کی فضائیں اسی انداز سے جگمگا رہی ہیں۔ یہ آفتاب پاکستان کے لئے آسمان پر تنہا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ کئی اور چراغوں کی روشنی بھی ہم آہنگ تھی جن کی ضو سے ہندوستان کی سرزمین سے برطانوی استعماریت کی تاریکی دور ہوئی اور صبح آزادی کے سورج کی پہلی کرن نے ارض پاک کی پہنائیوں میں سبز پرچم کو لہراتے ہوئے دیکھا، ان میں ایک چراغ کوہسار مری میں روشن تھا جو پہاڑ کے نوے ہزار غلام باشندوں کے دل و دماغ میں آزادی کی منزلوں کے نشانات روشن کر کے نئی صبح کے طلوع سے پہلے ہی گل ہو گیا تھا۔

یہ تحریک آزادی کا ہیرو سمندر خاں تھا۔ جس نے اپنے ناقابل شکست عزائم اور حسن کردار کی قوت سے مری کے ناخواندہ، اور مفلوک الحال باشندوں کو منظم کرنے کی کوشش کی۔ اس پر گاندھی نے علی برادران کی مدد سے عدم تعاون کی زبردست تحریک شروع کی۔ (۱۹۲۰ء) اس تحریک کا ختم ہونا تھا کہ دوسرے ہندو لیڈروں نے شدھی اور سنگھٹن کی اشتعال انگیز کارروائیوں سے ہندو مسلم تعلقات کو قطعاً خراب کر دیا۔ اس زمانے میں مسلمان لیڈر غفلت کی نیند سوئے رہے لیکن سائمن کمیشن کی آمد اور نہرو رپورٹ کی مسلم کش تجاویز پر وہ اپنے خواب گراں سے چونکے (۱۹۲۸ء) اور آل انڈیا مسلم کانفرنس میں جمع ہو کر انھوں نے ایک متحدہ سیاسی مطالبہ جو مسٹر جناح کے چودہ نکات سے مطابقت رکھتا تھا دنیا کے سامنے پیش کیا۔

۱۹۲۹ء میں کانگریس نے گاندھی کی قیادت میں مکمل آزادی کا اعلان کر کے سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی۔ اسی دوران میں لندن میں گول میز کانفرنس کا انعقاد ہوا (۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۲ء) اور برطانوی حکومت نے اپنا فرقہ وارانہ فیصلہ سنایا۔ لیکن ہندو لیڈروں کی ہٹ دھرمی کے باعث ہندو اور مسلمانوں میں کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔

۱۹۳۵ء میں نیا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ نافذ ہوا جس کی رو سے مرکز میں فیڈریشن اور صوبوں میں خود اختیاری حکومت کا نفاذ طے پایا۔

۱۹۳۷ء کے انتخابات کے بعد کانگریس پہلے چھ اور پھر دو اور صوبوں میں حکومت کرنے لگی۔ جس سے اس کا سر پھر گیا۔ اور اس نے مسلم لیگ سے منہ پھیر کر مسلمانوں کو بحیثیت ایک قوم کے ملیا میٹ کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ چنانچہ کانگریسی حکومت نے اردو کو مٹایا۔ ہندی کو ابھارا اور ہندو تمدن کے دیگر اداروں اور نشانات کو فروغ دے کر ہندوستانی مسلمانوں کی جداگانہ ہستی کو ہندوؤں میں مدغم کرنے کی بیسیوں اعلانیہ اور خفیہ سازشیں کیں۔

یہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ایک بے حد نازک وقت تھا۔ مسلمانوں میں کہنے کو کئی سیاسی جماعتیں تھیں

مسلم لیگ جو ۱۹۰۶ء میں قائم ہوئی کبھی سوتی اور کبھی جاگتی رہی۔ اس کے بعد ۱۹۱۹ء کے ہنگامہ خیز سال میں جمعیتہ العلماء بنی۔ ۱۹۲۹ء میں خدائی خدمت گار، اور مجلس احرار کا قیام عمل میں آیا۔ اسی سال نیشنلسٹ مسلمانوں نے بھی ایک کانفرنس منعقد کی وقتاً فوقتاً کئی اور فرقہ وارانہ انجمنیں مثلاً شیعہ کانفرنس وغیرہ بھی ظہور میں آتی رہیں۔ ۱۹۳۷ء میں جب کانگریس برسر اقتدار ہوئی اور اس نے مسلمانوں کی قومی ہستی کو ختم کرنا چاہا تو سوال پیدا ہوا کہ مسلمان اس کا جواب کیا دیتے ہیں۔ اس خطرناک وقت میں مسلم لیگ کی قیادت جس زبردست شخصیت کے ہاتھ میں تھی اس نے کانگریس کے چیلنج کو دلیری سے قبول کیا۔ یہ قائداعظم محمد علی جناح تھا۔ جو ایک طرف سیاسی بات چیت میں انگریزی حکومت اور کانگریسی لیڈروں کے ساتھ پورا اترا اور جس نے دوسری طرف اپنی لاجواب شخصیت کے بل بوتے پر ایک پراگندہ اقلیت کو ایک مستقل قوم بنانے میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔

یہاں تک کہ جنوری ۱۹۴۷ء میں مسلم لیگ کی ایک زبردست تحریک اٹھی جس میں مردوں اور عورتوں نے یکساں حصہ لیا اور جو صرف ایک ماہ جاری رہ کر بہت نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔ برطانوی حکومت اس سے متاثر ہوئی۔ اور اسے یقین ہوگیا کہ اسلامیان ہند کے قومی مطالبے کو اب دیر تک معرض التوا میں نہیں رکھا جاسکتا۔ ادھر پاکستان کے مخالفین نے ملک بھر میں فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ شروع کر دیا، جو آخر سال تک جاری رہا جس کے ضمن میں ایک منظم سازش کے تحت آٹھ دس لاکھ بے گناہ مسلمانوں کو بے رحمی سے تہ تیغ کردیا گیا۔ اسی دوران میں برطانیہ نے ۳ جون کو ہندوستان و پاکستان کی آزادی کے متعلق اپنا نیا منصوبہ شائع کیا جس کے مطابق ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو دونوں ملکوں میں دو علیحدہ علیحدہ خودمختار حکومتیں قائم ہوگئیں۔ یوں اسلامی ہند کے دس کروڑ فرزندان توحید کی تنظیم اور قربانیاں پھل لائیں اور مشرقی اور مغربی ہند میں مشرقی و مغربی پاکستان کی بنیاد پڑی۔

فون: ۶۵۴۷۹

انجمن ترقی اردو ٭ لاہور

ناظم اعلیٰ:-
ڈاکٹر سید عبد اللہ

۱۷- اردو نگر، ملتان روڈ
لاہور

دکانداروں، بڑے تاجروں اور فرموں کے مالکوں کے نام!

مکرم و محترم - السلام علیکم - مزاج شریف

ہمیں یہ معلوم کر کے بے حد خوشی ہوئی ہے کہ آپ، اپنے کاروباری اور تجارتی اشتہار کیلئے قومی زبان اردو کو اپنا رہے ہیں۔ ہم نے مختلف رسالوں کے علاوہ، عام گزر گاہوں اور بسوں پر بھی آپ کے اردو اشتہار دیکھے ہیں، ہمارا تأثر یہ ہے کہ جمہور پر آپ کے اردو اشتہار کا اچھا اثر پڑتا ہے اور یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ قومی زبان میں لکھا ہوا اشتہار انگریزی سے زیادہ پڑھا جاتا ہے اور پسند بھی کیا جاتا ہے ہم آپ کو مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ ہم آپ کی قومی حمیت کا اعتراف کرتے ہیں۔ اور توقع رکھتے ہیں کہ آپ اس نیک عمل کو جاری رکھیں گے۔

اس سلسلے میں ہم آپ کو اپنے تعاون کا یقین دلاتے ہیں اور آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ

(۱) آپ کو اپنے اشتہار کی زبان کے سلسلے میں اگر کوئی تکلیف ہو تو آپ ہم سے خط و کتابت کیجئے، ہم زبان کی مشکلات دور کرنے کے لئے ہر وقت موجود ہیں۔

(۲) آپ نے اس وقت تک، اردو میں جو جو اشتہار لکھوائے یا چھپوائے ہیں، ان کی نقول ہمیں اپنے دفتری اندراجات کے لیے درکار ہیں — ارسال فرما کر ممنون فرمائیں۔

(۳) ہمارا ارادہ ہے کہ ستمبر ۱۹۶۷ء کے آخر میں اشتہارات کی ایک نمائش کریں اور اس موقعے پر ایک جلسہ عام منعقد کر کے، بہترین اور پسندیدہ ترین اشتہارات والی فرموں کا تمغوں کے ذریعے اعتراف کیا جائے اس کے لیے نقول اشتہارات مطلوب ہیں، از راہ کرم جلد توجہ کر کے ممنون ہونے کا موقع دیجیے۔ شکریہ

نیازمند

(ڈاکٹر) سید عبد اللہ

ناظم اعلیٰ انجمن ترقی اردو، لاہور

شمیم احمد

بیس سال کے ادبی رجحانات اور اُن کا پس منظر

۱۹۴۷ء برصغیر کی تاریخ ہی میں ایک اہم موڑ نہیں تھا بلکہ اس نے ادب اور تہذیب کے ورثے پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں جن کی وجہ سے یہ سال برصغیر کے ذہنی اور شعوری سفر میں ایک تعلق نکتہ ابھرتا ہے۔ جس نے آزادی اور ما قبل آزادی سے قبل کے ادب اور فکری تحریکوں کو اگر یکلخت زمین بوس نہیں کیا تو کم از کم انہیں اتنا سست رو، کمزور اور بے سہارا ضرور کر دیا جس سے جدید راہ بنانے کے لئے کسی بہت بڑے فکری افق اور ذہنی انقلاب کی ضرورت شدت سے روز بروز محسوس ہو رہی ہے۔ اس کی وجہ لکھنے والوں میں صرف خلوص کی کمی یا تخلیقی جذبوں کا بے تہ ہو جانا اور کسی آدرش پر خواہشات کا غالب آ جانا ہی نہیں ہے بلکہ برصغیر کی فکری سطح اور اس کے شعوری سفر کا وہ عظیم نقصانات سے دوچار ہو جانا ہے۔ جس کی جگہ جن تخلیقی اور تعمیری قوتوں کو لینی تھی وہ بروئے کار نہ آ سکیں۔ اس کے نتیجے میں پاکستان کا بیس سال کا ادب لڑکھڑا کر رہ گیا۔ یہ نقصانات کیا تھے ان کا تجزیہ میں آپ کے سامنے پیش کئے دیتا ہوں تاکہ پاکستان کے ذہنی سفر کی ان بیس منزلوں کا ادبی، سیاسی اور شعوری پس منظر ذرا وضاحت سے ہمارے سامنے آ سکے۔

۱۹۴۷ء برصغیر کی تاریخ میں وہ مقدس موڑ ہے جب برصغیر کی دو بڑی اقوام نے غیر ملکی تسلط اور غلامی سے نجات حاصل کی۔ اور یہ نجات یوں ہی حاصل نہیں ہو گئی تھی بلکہ اس کے پیچھے ۴۰ کروڑ افراد کی سو سالہ جدوجہد، قربانیاں، قید و بند، ظلم و ستم اور ایک مسلسل شعوری جنگ کی قوت نبرد آزما تھی۔ یہ آزادی ایک بہت بڑی سیاسی جدوجہد، اور برصغیر کی ان امیدوں اور تمناؤں کا حاصل تھی جس کے حصول میں وطن کا ذرہ ذرہ آتش شوق میں شمع آزادی بن گیا تھا۔ ہر بڑی جدوجہد اگر وہ غلامی سے نجات پانے کی جدوجہد ہو تو قوموں کے لئے موت و زیست کا مسئلہ بن جاتی ہے۔ جس میں اس کے تمام باطنی تضادات مٹ جاتے ہیں اور اس کی تمام شعوری، تخلیقی، جذباتی، خارجی اور عملی توانائیاں ہم آہنگ ہو کر اسے ایک پرقوت شخصیت اور مضبوط کردار عطا کرتی ہیں۔ جس میں ہر قوم کی تمام نفسی خواہشات، ذہنی اور جذباتی تفریق اور تضاد، ذاتی اغراض اور مفادات، رنگا رنگ شخصی عناصر اور الگ الگ ذہنی سفر سب غیر اہم بن جاتے ہیں اور ان سے بلند کوئی آدرش ان سب کی جگہ لے لیتا ہے۔ اور یہی آدرش بالآخر ان کی تاریخ کی سب سے بڑی سچائی اور مینارہ نور بن جاتا ہے جس کی روشنی میں وہ صدیوں اپنے نقوش قدم ثبت کرتے رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہر ایسی قوم کا ادب اس قوم کی اس جدوجہد میں برابر کا شریک ہوتا ہے، اس کی توانائی کا عکاس ہوتا ہے اور اس کی تعمیری اور تخلیقی قوتوں کا حامل ہوتا ہے جس کا شعلہ

اس کے قومی کردار کو صدیوں گرمائے رکھتا ہے۔ دنیا کی اقوام کا جائزہ لیتے ہوئے اگر ہم ایسے لمحوں کا ادب الگ کر دیں تو ہمیں یہ بہت واضح طور پر نظر آ جائیگا کہ وہ اپنی تخلیقی جدوجہد، تعمیری صلاحیت اور شعوری توانائی میں ان لمحوں سے الگ تخلیق ہونے والے ادب سے بہت ممتاز، منفرد اور بھرپور نظر آتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی تاریخ اس بات کی گواہی بھی دیتی ہے کہ اگر حصول آزادی یا آدرش کے بعد اسکی جگہ کوئی اور آدرش یا تعمیری قوت نہیں لے سکتی ہے تو پھر اس کی جگہ ایک خلا سست رفتاری اور بے دست و پائی کا احساس لے لیتا ہے۔

۱۹۴۷ء میں برصغیر کی تاریخ میں بھی ایک ایسا مقدس لمحہ آیا جب آدرش حقیقت بن گیا۔ آزادی جس کے لئے نسلوں نے جدوجہد کی تھی اور قربانیاں دی تھیں وہ حاصل ہو گئی اور اسکی جگہ کوئی ویسا ہی آدرش، ویسا ہی نصب العین اور ویسی ہی پر قوت تحریک نہیں لے سکی۔ جس کی وجہ سے فطری طور پر ادب کی رفتار کو تو سست اور بے ثمر ہونا ہی تھا۔ آزادی کا کوئی متعین رُخ نہ ہونے کی وجہ سے اس میں وہ کردار، توانائی، یکجہتی تخلیقی اور تعمیری قوت اور ذہنی معیار کیسے برقرار رہ سکتا تھا۔ جو ایک روشن اور تابناک منزل کی طرف بڑھنے والے قافلے میں لازماً ہوتا ہے —— ۱۹۴۷ء میں پاکستان میں ادب تخلیق کرنے والوں کے ساتھ یہ عمل جو یقیناً تاریخی جبر بھی تھا بری طرح چمٹ گیا۔ جس کو ایک اور قباحت نے اور بھی سنگین بنا دیا تھا۔ یہ قباحت یہ تھی کہ پاکستان دو حصوں میں تقسیم تھا جن کے درمیان ایک ہزار میل کا فاصلہ حائل تھا۔ اس کی وجہ سے پاکستان کی مجموعی قوت کو ذہنی اور معاشرتی سطح پر پھیلنے پھولنے اور انفرادی کردار کی نشو و نما کے یکساں مواقع اور ذہنی تربیت حاصل نہیں تھی —— ان دونوں حصوں کے درمیان ایک ہی رابطہ تھا جس سے وہ کئی سطحوں پر جڑے ہوئے تھے اور وہ رشتہ اور رابطہ اسلام تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آزادی کے حصول کے بعد کوئی دوسرا مشترک نصب العین یا مشترک قدر ایسی پیدا نہ ہو سکی جو پاکستان کے مختلف حصوں اور طبقوں کو ایک سطح، ایک انداز فکر اور ایک طرز احساس پر مجتمع کر سکے۔ حصول آزادی کے بعد یہ ایک بہت بڑا خلا تھا جس کو کوئی نہ کوئی معاشرتی تصور، نظام نیا یا آدرش پر کر سکتا تھا مگر کسی ایسے تصور کی عدم موجودگی نے ذہنی سفر اور افہام و تفہیم کو معطل کر کے رکھ دیا۔ یہ دوسرا نقصان تھا جس کو پاکستان کے قیام کے لکھنے والوں اور سوچنے والوں نے برداشت کیا۔

آزادی سے قبل برصغیر کی ادبی سطح پر کئی تحریکیں اور کئی ادبی محاذ تحریک آزادی کو مضبوط بھی بنا رہے تھے اور انہیں ایک آدرش، نصب العین اور نظام نیا بھی مہیا کر رہے تھے۔ جن میں سب سے زیادہ طاقتور ادبی محاذ انجمن ترقی پسند مصنفین کا تھا۔ جس کا مطمح نظر اشتراکی معاشرے کا قیام تھا۔ دراصل حصول آزادی کے بعد جس مقصد اور آدرش کو آگے لے کر بڑھنا تھا وہ کوئی ایسا تصور یا نصب العین ہو سکتا تھا جو آزادی کے بعد معاشرے کی تشکیل میں اسی طرح بنیادی اہمیت کا مالک ہو سکتا جس طرح تحریک آزادی میں غلامی سے نجات پانے کا تصور تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ترقی پسند مصنفین اور تمام تعمیری نظام کے حامی ادیب بیک وقت دو اہم فریضوں کو پورا کر رہے تھے۔ ایک حصول آزادی دوسرا اس کامیابی کے بعد متبادل آدرش۔ جن میں دوسرا مقصد اس لئے زیادہ اہم تھا کہ ادیب اور سوچنے والے فنکار، سیاست داں کی طرح اقتدار کو وقتی فرضیتوں اور مصلحتوں پر قربان نہیں کر سکتے تھے۔ جہاں تک اجتماعی شعور کا سوال ہے یہ بات ناقابل تردید ہے کہ ادبی محاذ پر آزادی سے زیادہ آزادی کے بعد والی قوت کی تشکیل اور تعمیر کی جا رہی تھی۔ مگر اشتراکی نظام کا نصب العین اور آدرش برصغیر کے کروڑوں باشندے

کی روح اور ان کے معاشرتی تضاد یا تہذیبی عمل سے چونکہ نہیں پھوٹتا تھا اس لئے وہ برصغیر کی جمالی روح پر کوئی گرفت نہیں رکھتا تھا۔ اس عمل کو ایک اور کمزوری بالکل ہی لے ڈوبی اور وہ یہ تھی کہ برصغیر میں اشتراکی رجحانات اور اشتراکی نظام فکر ایک فیشن اور ایک سیاسی قوت کے زیر اثر قبول کئے گئے تھے۔ جنکی بنیاد میں برصغیر کی معاشی اور معاشرتی حقیقتوں سے زیادہ ایک اونچے درجے کے محدود پڑھے لکھے طبقے کی رومانیت کام کر رہی تھی۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت روس میں اشتراکی نظام کامیاب ہو چکا تھا اور وہ مغرب کی بڑی طاقتوں کی مشرق دشمنی، معاشی استحصال اور سیاسی ریشہ دوانیوں کے خلاف آزادی کے لئے کوشاں اور ادیبوں انسانوں کے حقوق کا سب سے بڑا داعی تھا جو بہر صورت غلامی اور اپنے معاشی مسائل کا حل چاہتے تھے۔ روس اس وقت ایک ایسی سیاسی طاقت بن چکا تھا جس کو نظر انداز کرنا کوئی آسان بات نہ تھی۔ اشتراکی نظام فکر نے واضح طور پر مغرب کے زوال آمادہ نظام حکومت کو شدید ضربیں لگائی تھیں اور صدیوں کے غلام مشرق کو غلامی کی زنجیریں توڑ پھینکنے کی دعوت دے کر تحریک آزادی کو برق رفتار بنا دیا تھا۔ یہ روس کے سیاسی استحکام اور عالمی مقبولیت اور رنگاؤ کے انتہائی نقطہ عروج کا زمانہ تھا۔۔۔ اسی کردار کی وجہ سے اشتراکیت سے اختلاف رکھنے والے مفکرین اور لکھنے والے بھی اس کے مثبت اثرات اور بے پناہ مقبولیت کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکے۔ دراصل اشتراکی نظام فکر ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۰ء تک تمام عالمی مسائل اور ان کی پیچیدگیوں کا سب سے واضح حل تھا۔ جس کا سب سے بڑا نشان مغربی استعماریت اور شہنشاہیت تھی۔ جو مشرق کے لئے تریاق کا حکم رکھتی تھی۔ اسی کی اہمیت کے پیش نظر وہ چاہے خواہ حکیم الامت اقبال ہوں خواہ رابندرناتھ ٹیگور سب کے لئے ایک اہم ترین فکری مرکز کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ مغربی نظام حکومت اور استعماریت کے خلاف روس کی اس جدوجہد کو مشرق کی کوئی سیاسی جماعت اور تحریک نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ جس کے نتیجے کے طور پر برصغیر میں بھی اشتراکی نظام فکر کو اور روس کی اشتراکی مملکت کو ایک آدرش کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اور جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ یہ اس وقت کی سیاسی اور معاشی ضرورت سے پیدا ہوئی تھی اور اس کا مقصد سماجی انقلاب سے زیادہ سیاسی مفادات کو بروئے کار لانا تھا۔ اشتراکیت برصغیر میں یہاں کی معاشی، معاشرتی، سیاسی اور تہذیبی تضادات کا لازمی نتیجہ نہیں تھی اور نہ وہ یہاں کی تاریخ کے دھارے کا حصہ بن سکتی تھی بلکہ اس کو ایک مشرق اور انسانیت دوست سیاسی طاقت کی وجہ سے مقبولیت حاصل تھی جس کو روس کی معاشرتی اور سیاسی کامیابی نے مزید استحکام بخشا تھا۔ اس لئے بالکل اسی طرح جیسے موجودہ دنیا تین دھڑوں، امریکہ اور اس کے مغربی حلیفوں، روس اور اس کے مشرقی حلیفوں اور چین کے درمیان بٹ گئی ہے۔ اور نو آزاد اور معاشی طور پر ضرورت مند مشرقی ممالک ان میں سے کسی ایک کے ساتھ وابستہ ہونا یا سب کے ساتھ معتدل روش رکھنا ضروری سمجھ رہے ہیں۔ بالکل اسی طرح ۱۹۴۷ء سے قبل ان تمام ملکوں کے لئے ایک ہی ہمدرد دوست اور آخری امید تھی اور وہ صرف روس تھا۔ اس لئے برصغیر کی تمام سیاسی تحریکیں جو آزادی کے لئے لڑ رہی تھیں روس کو نظر انداز کر ہی نہیں سکتی تھیں۔ نظریاتی طور پر اشتراکی نظریے نے اس پورے عمل کے ساتھ ساری دنیا کے لئے آدرش کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ جس سے برصغیر کا سب سے حساس طبقہ کیسے آنکھیں چرا سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے یہاں کے ادیبوں نے بھی خود کو دنیا بھر میں روس کی سب سے بڑی دین یعنی منظم تحریکوں یا تنظیمی طریقہ کار سے وابستہ کر لیا اور

ادیبوں کی ایک تنظیم قائم کر کے اپنے عصری کردار کو پوری قوت سے انجام دینے کی کوشش کی۔ یہ ایک ایسی رومان پرستی تھی جس کی حقیقت بینی اور مادی قدر کا شعور تو بہت تھا مگر اس کے سلسلے میں برصغیر میں اس کے حقیقی کردار، زمینی تعلق اور ذہنی رشتوں کو نظرانداز کر دیا گیا تھا۔ یہ اسی رومان پرستی کا نتیجہ تھا کہ لکھنے والوں کی نظر سے وہ حقائق اوجھل رہے جنکی بنیاد پر برصغیر۔ ایک اور سمت تیز رفتاری سے رواں دواں تھا۔ یہ سمت قوم پرستی اور احیائے مذاہب اور تہذیبی اکائیوں کی سمت تھی۔ اس رویے اور عمل میں ایک اور حقیقت بھی کام کر رہی تھی اور وہ یہ تھی کہ ادبی محاذ پر جو جماعتیں کام کر رہی تھیں وہ کم و بیش تمام تر متوسط طبقہ یا اونچے طبقے کے پڑھے لکھے نوجوانوں پر مشتمل تھیں جن کا ربط اور تعلق اس ملک کے کروڑوں افراد سے اور اس اصل اور بنیادی آبادی سے بالکل نہیں تھا جو شہروں سے باہر بستی تھی۔ اس طرح وہ اپنے معاشرے کی تمام قوموں کی شخصیت کے اشتراک اور بنیادی مسائل، طرز معاشرت اور طرز احساس سے بیگانہ ہو کر برصغیر کے اصل باشندوں کے باطنی عمل، ذہنی مسائل، جذباتی لگاؤ اور رجحانات کا کوئی اندازہ نہ کر سکے۔ وہ صرف شہری زندگی کے نمائندہ تھے اور صرف شہری شعور اور مسائل کا اظہار کر کے اس پر سارے ملک کا قیاس کر رہے تھے۔ اس کے برخلاف خالص سیاسی تحریکوں کا تعلق عوام سے براہ راست اور بہت گہرا تھا۔ وہ ان کو صرف حصول آزادی پر ہی نہیں لگائے ہوئے تھیں بلکہ ان کے ذہنی اور جذباتی عوامل سے بھی خوب واقف تھیں۔ چنانچہ برصغیر کی تحریک آزادی کے انتہائی نقطۂ عروج پر بھی صرف دو ہی سیاسی جماعتیں کانگریس اور مسلم لیگ سب سے نمایاں اور اہم نظر آتی ہیں۔ اور اُن کی مقبولیت اور حلقۂ اثر کے سامنے اشتراکیت کا حلقۂ اثر بہت محدود اور غیر اہم نظر آتا تھا۔ اگر ہم ۱۹۲۵ء سے ۱۹۴۷ء تک سیاسی قوت کی تقسیم کر کے ان کا وزن دیکھنا چاہیں تو ہمیں کمیونسٹ پارٹی صرف شہروں کے نوجوانوں کے حلقوں، طالب علموں کے طبقے اور نوجوان سیاسی کارکنوں کی تنظیم کے علاوہ کہیں اور اپنا وجود ثابت کرتی نظر نہیں آئیگی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ تاریخی طور پر مسلم لیگ، کانگریس کے مسلم دشمنی کے رویے سے پیدا ہوئی ہے۔ مگر یہ اصل حقیقت نہیں ہے بلکہ اس سے بھی بڑی حقیقت یہ تھی کہ مسلم لیگ برصغیر کے دس کروڑ افراد پر مشتمل ایک قوم کی معاشی، سیاسی اور معاشی فردیت کے احساس سے پیدا ہوئی تھی۔ جس کو الگ حیثیت ایک منفرد قومی ورثے، منفرد تہذیب اور کردار کی بنیاد پر منوانی تھی۔ مسلم لیگ کو یہ آسانی اسلئے اور بھی حاصل تھی کہ وہ ایک ایسے نظام معاشرت اور ضابطۂ حیات کی دعویدار تھی جو خود ایک آدرش کی صورت میں اس کے باطن میں صدیوں سے موجود تھا۔ اسلام کی صحیح ترین بنیادوں اور روح پر مشتمل ایک ایسے معاشرے کا قیام جہاں انسانی اقدار اور کردار کی کامل نعمتیں حاصل ہو سکیں۔ جس کا صحیح ترین تجربہ خلافت راشدہ تھی۔ خلافت راشدہ کی صورت میں خالص قرآنی معاشرے مختصر ہی سہی۔ مگر کامیاب تجربے نے مسلمانوں کو دنیا کی دیگر اقوام پر اس لئے فوقیت دے دی تھی کہ سوائے اس کے دنیا کے کسی اور خطے میں کسی ایسے آدرش کا سراغ نہیں ملتا جو ایک کامیاب عملی تجربے کی حیثیت میں پورے معاشرے کو بدل کر صرف آدرشی بنیادوں پر نئے سرے سے تعمیر ہو سکا ہو۔ خواہ اسے تیرہ سو برس ہی کیوں نہ گزر گئے ہوں مگر ایک ایسے مثالی معاشرے کے دوبارہ قیام کی تمنا تمام عالم اسلام کی ایک سچی اور زندہ خواہش ہے جو انہیں ہمیشہ جدوجہد پر آمادہ کرتی رہتی ہے۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ

ایک اسلامی معاشرے کے تصور پر ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ از سر نو منظم ہوئی ہے اور صرف سات سال کی مدت میں یہ ثابت کر دیتی ہے کہ وہ دس کروڑ افراد پر مشتمل ایک ایسی منظم قوت ہے جس کو دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت دبا نہیں سکتی۔ کمیونسٹ پارٹی اور ترقی پسند مصنفین کو برصغیر کی اقوام کے باطنی عمل کا چونکہ کوئی اندازہ نہیں تھا۔ اس لئے وہ روس کی اور اشتراکی نظریئے کے ایک مخصوص حالات کی کامیابی کے نشے میں ایک رومانی دنیا میں بسر کرتے رہے۔ قومی نظریات صرف دشمنی فرقہ پرستی نہیں تھے بلکہ اس کی جڑیں عوام کے دلوں میں بڑی گہرائی تک پیوست تھیں۔ اور اسی وجہ سے چند سال کی مدت میں اس سے ایک انقلاب کا کام لیا جا سکا۔ خواہ اس کا تجزیہ اور توجیہہ کسی طرح بھی کی جائے مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ جہاں تک عوام کا تعلق ہے وہ اپنے عمل اور فکر میں اسی آدرش سے متاثر تھے اور اس میں کسی قسم کی سیاسی مصلحت اور مفادات کے پیش نظر نہیں تھا۔ تقریباً یہ وہ سیاسی اور ادبی فضا تھی جس میں مسلمانوں کی سب سے بڑی مملکت وجود میں آئی اور دنیا میں ایک ایسا ملک پہلی بار ظہور میں آیا جس کو خالصتاً ایک آدرش، ایک مثالی معاشرہ اور ایک بڑے مبنی تصور کی بنیاد پر قائم کیا گیا تھا۔ یہ سخت بدنصیبی ہوگی اگر اس حقیقت کا اعتراف نہ کیا جائے کہ مسلم لیگ کی ساری سیاسی جدوجہد اور تصور پاکستان کی عملی تحریک ایک مرکزی شخصیت میں ڈھل گئی تھی جس کا نام قائد اعظم محمد علی جناح تھا۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو اس مرکزی شخصیت نے بساط عالم پر پاکستان کی بساط جما کر جس سیاسی منصوبے اور طریقۂ کار کو سامنے رکھا اس میں روس کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ یہ بات بالکل طے ہے کہ قائد اعظم اپنے سیاسی تدبر اور دور اندیشی کے لحاظ سے اپنی تمام ہم عصر تاریخ ساز شخصیتوں میں ممتاز اور منفرد تھے۔ اور ان کی دور اندیش نگاہ نے سب سے پہلے یہ بھانپ لیا تھا کہ معاشی اور سیاسی مفاد کے تقاضے کے پیش نظر پاکستان کو کس راستے پر چلنا ہے۔ یہی وہ راستہ تھا جس پر بعد میں ایشیا اور افریقہ کی ممتاز ترین سیاسی شخصیتیں جادہ پیما ہوئیں۔ پاکستان کے قیام کے فوراً بعد قائد اعظم کا سب سے اہم بیان وہ تھا جس میں انہوں نے اسلامی سوشلزم کو پاکستان کے لئے لازمی قرار دیا تھا۔ اور روس کی دعوت کو فوراً قبول کر لیا تھا۔ یہ اسلامی سوشلزم دراصل ان کی سیاسی سوجھ بوجھ اور دانشمندی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ جس کو بعض غلط اندیشوں نے اس کے سیاسی تصور سے ہٹا کر اپنے گھناؤنے اور ذاتی اغراض اور مفاد کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ اور آج اس کو بڑے پیمانے پر ہوا دی جا رہی ہے۔ مگر تاریخ اور دیانت دونوں سے عاری ہو کر۔ قائد اعظم کی نظر میں اسلامی سوشلزم کے وہی معنی تھے جس پر بعد میں نہرو نے ہندوستان کو اشتراکی معاشرے کی طرف لے جانے کا نعرہ لگایا تھا اور اس سے بڑے فوائد حاصل کئے تھے۔ دوسری اہم بات جس کو نظر انداز کرنا پاکستان کے مخلص ترین فرزندوں کو زیب نہیں دیتا۔ یہ ہے کہ قائد اعظم کو یہ بہت اچھی معلوم تھا کہ مغرب اور خصوصاً برطانیہ پاکستان کے ساتھ کبھی انصاف نہیں کر سکتا۔ اور یہ بات انہیں حصول پاکستان اور اس کے بعض نتائج کے عملی تجربے نے بتائی تھی۔ جس کا سب سے بڑا ثبوت ریڈکلف ایوارڈ کی جانبداری اور کشمیر کا پیدا کیا ہوا ناسور ہے۔ قائد اعظم کی بے خطا سیاسی سمجھ بوجھ نے اپنے لئے صحیح نشانہ اور رویہ منتخب کر لیا تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ قائد اعظم سب سے پہلی قانونی آزادی حاصل ہوتے ہی سب سے پہلے

دولت مشترکہ سے علیحدگی اختیار کرلینے۔ یہ بات برطانیہ کے گرگ باراں دیدہ خوب جانتے تھے کہ وہ پہلے شخص ہونگے جو اس فیصلے کو عملی جامہ پہنا سکتے ہیں۔ اور اس کی سبب سے بنیادی حقیقت یہ تھی کہ ان کا پاکستان کے عوام پر بے پناہ اثر اور ان کے خلوص و دیانت کی بے مثال گرفت تھی۔ چنانچہ پاکستان نے بہت جلد آہوں اور سسکیوں کے درمیان اس مرکزی شخصیت کو سپرد خاک کردیا۔ اس سانحے کے بعد پاکستان صرف نو آبادی سطح کا ملک رہ گیا۔ کیونکہ اس کا آدرش، اسکی قوت خاک میں مل چکی تھی۔ اور پھر وہ زمانہ بھی آیا جب پاکستان استعماری طاقتوں کا کھوٹا مصنوعی سیارہ بن کر رہ گیا۔ تحریک پاکستان کی سب سے بڑی قوت اور مسلمانان ہند کا آدرش اسلام صرف ایک دعویٰ بنا اور انجمن ترقی پسند مصنفین تک ممنوع قرار دے دی۔

اس منزل سے آگے بڑھنے سے پہلے ہمیں دنیا کے ان تین سیاسی محوروں کا ایک سرسری جائزہ لینا ہوگا۔ جس سے پاکستان کی سیاسی اور ذہنی تاریخ کا المیہ وابستہ ہے۔ امریکہ۔ جس کے در دولت سے پاکستان کو قائد اعظم کے بعد وابستہ کیا گیا۔ خالصتاً استعماری قوت کا مظہر تھا جس کی سب سے بڑی بدنصیبی یہ تھی کہ اس کے پاس کوئی ایسا نظام خیال یا ایسا نظام معاشرت نہیں تھا جسکی بنیادوں پر کوئی نو آزاد قوم اپنا مستقبل اس سے وابستہ کرسکتی۔ وہ فکری قوت اور ایک نظام خیال کی صورت میں محض صفر تھا۔ اس کے پاس بے اندازہ دولت تھی۔ اور اناج کی لاتعداد ذخیرہ گاہیں تھیں۔ امریکہ وہ واحد قوم تھی جو تنہا ایک ملک نہیں بلکہ ایک براعظم کو اپنے صرف میں لا رہی تھی اور قدرت کے اس "وفور اتفاق" سے دنیا کو اپنے حلقۂ اثر میں لانے کی سر توڑ کوشش کررہی تھی۔ دوسری بے بضاعتی یہ تھی کہ وہ عالمی نقشے میں ایک ایسی تازہ ابھرتی ہوئی قوم تھی جسکو صرف تین سو برس کی تاریخ حاصل تھی۔ اور جسکو خود غلام بننے اور غلام بنانے کے مواقع ہنوز حاصل نہیں ہوئے تھے۔ در اس اعتبار سے اس کا تعلق ربط اور واقفیت مشرق سے نہ ہونے کے برابر تھی۔ جس کی سیاسی بصیرت ناقص اور معلومات ناکافی تھیں۔ گو کہ وہ برطانیہ کی ناخلف اولاد فرور تھی مگر ایک سیاسی طاقت کی صورت میں وہ ناپختہ ذہنیت اور طفلانہ تصورات کی حامل تھی۔ اسی وجہ سے اس کا خیال تھا کہ صرف دولت اور اناج کی فراہمی کی بنیاد پر وہ ساری دنیا کو اگر نہیں تو سارے مشرق کو فرور اپنا حلقہ بگوش بنا سکتی ہے۔ جبکہ اس کے سیاسی رہنماؤں کو اتنا بھی نہیں معلوم تھا کہ صرف مالی سودے بازی میں ضرورت مند اقوام اور ممالک ضمیر فروشی کے ذہنی خلجان میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی جتنا کھاتا جاتا ہے اتنا ہی اسکو گالیاں بھی دیتا جاتا ہے۔ صرف معاشی ضرورت اور سودے بازی کی بنا پر جھکنے والی قوم ہمیشہ اس امداد کے وزن کا بوجھ اپنے ضمیر پر محسوس کرتی رہتی ہے۔ اور یہی امریکہ کی تقدیر ہے۔ اس کے نتیجے میں پاکستان کو امریکہ سے وابستہ کرنے والوں نے جس عالمی حقیقت کو جھٹلانے کی غلطی کی تھی اس کی بنا پر امریکہ آج تک کسی بھی ملک کو حقیقی طور پر اپنا دوست نہیں بنا سکا۔ امریکہ کی طرف لے جانے میں پس پردہ جس قوت نے سب سے زیادہ تگ و دو کی تھی گو کہ آج اسے وہ طاقت حاصل نہیں اور وہ ایک سسکتی ہوئی قوم ہے مگر اسی پر دنیا کے سب سے بڑے گناہوں کا بوجھ ہے۔ یہ طاقت جس پر اب یہ مثل پوری طرح صادق آتی ہے۔

قحبہ چوں پیر شود پیشہ کند دلالی

یہ برطانیہ تھا جس نے مشرق کے خون پر مغرب کو توانا بنایا تھا۔ اور جو سارے مشرق پر دو سو سال تک یکہ و تنہا حکومت کرتا رہا تھا۔ اس کے پاس بھی نظریاتی طور پر کچھ نہیں تھا۔ مگر مشرق سے اس کے روابط کسی اور مغربی ملک کے مقابلے پر سب سے زیادہ تھے۔ وہ مشرق کی گہرائی تک دوررس اثرات رکھتا تھا۔ مشرق کے ہر خطے میں اس کے پروردہ اور آوردہ بڑی مضبوط بنیادوں پر کھڑے تھے اور قومی محاذوں پر اس کے سایۂ عاطفت میں ماضی کی (تمغی) خدمات کو آج بھی انجام دے رہے تھے جن سے کبھی قومی مقاصد کو ختم کرانے اور قوموں کو غلام بنانے کا کام لیا گیا تھا۔ آج بھی ان لوگوں میں سرکار برطانیہ کا خون گردش کر رہا تھا۔ برطانیہ کے یہ نادیدہ ہاتھ جو آج بھی قوموں اور ملکوں کی تقدیر بدل دیتے ہیں مشرق میں برطانیہ کے مفادات کے سب سے بڑے محافظ ہیں۔ اس طرح یہ بوڑھی، ناتوان اور دم توڑتی مکارانہ سیاست آج بھی مشرق کی حکمران ہے۔ اور دوسرے تر عالمی سطح پر امریکہ کے ہاتھ مضبوط کرتی رہتی ہے۔ برطانیہ ایک طاقتور ملک کی صورت میں گو کہ افسانہ ماضی بن چکا ہے مگر اسکی اصلی قوت اس کے وہ سیاسی گُرگے ہیں۔ جن کے سامنے مشرقی اقوام ہنوز طفل مکتب ہیں۔ یہ انہی کی چالاک سیاست ہے کہ جب چاہتے ہیں مشرقی اقوام میں سیاسی دباؤ اور سازشوں سے سیاسی اتار چڑھاؤ لاتے رہتے ہیں۔ جن کی سب سے قبیح فراست یہ ہے کہ اس کا رخ کبھی برطانیہ کی طرف نہیں ہوتا۔ اور نہ وہ کبھی سیاسی تنازعات اور سیاسی دباؤ میں اپنی جھلک آنے دیتا ہے۔ وہ نہایت عیارانہ خاموشی سے مشرق کے سیاسی توازن کو ناپنے اور اپنے حلیف ممالک کے حق میں کرتا رہتا ہے۔ اس کو اگر مشرق کی کسی چیز سے خطرہ ہے تو دو چیزوں سے ہے۔ ایک کسی مملکت کی ایسی مرکزی شخصیت کی موجودگی جو عوام میں بے پناہ مقبول ہو اور اپنی دیانت اور کردار کے لحاظ سے مثالی ہو۔ ایسی مرکزی شخصیت کی موجودگی میں اسے ایک خوف ستاتا رہتا ہے کہ اگر ایسی شخصیت کہیں موجود ہے تو وہ کسی لمحے میں بھی اپنی قوم کو اس کے سیاسی دائرے اور دھڑے بندی سے آگاہ ہو کر اس کے سیاسی اقتدار کے سرچشمہ "دولت مشترکہ" سے علیحدہ کر سکتی ہے۔ دوسرا خطرہ اسے من حیث المجموع اسلام سے ہے۔ اور صرف اسی وجہ سے نہیں ہے کہ پوری عیسائی دنیا اور مغربی ملکوں کو اس سے ہمیشہ قلبی نفرت رہی ہے بلکہ اس لئے بھی ہے کہ دنیا کے نئے آزاد ہونے والے ممالک میں مسلمان ملکوں کی اکثریت ہے۔ جس سے دنیا میں ایک نیا بلاک بننے کے امکان روشن ہو گئے تھے۔ برطانیہ کو اپنی ساری کوششوں کے باوجود اسلام اب بھی ایک عالمی سیاسی قوت بنتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور یہ خطرہ اسے دوسرے مغربی ملکوں سے اس لئے زیادہ ہے کہ اسے اپنے دو سو سالہ دور اقتدار میں بارہا اس کا تجربہ ہوا ہے کہ وہ اچانک طوفان بن جانے کے پورے جراثیم رکھتا ہے۔ برطانیہ مشرق کے لئے ایک ایسا بھوت ہے جسکو اپنے مدفن میں بھی آرام میسر نہیں۔ تیسری طرف روس کی طاقت تھی جسکو ایک ایسی قوت حاصل تھی جس سے پورا مغرب محروم تھا۔ یہ اس کی نظریاتی قوت تھی جس کے پیرو، حامی اور ماننے والے بالخصوص کچی عمر کے لوگ از خود بغیر کسی سودے بازی اور ضمیر فروشی کے خلجان کے خود بخود بھوک اور افلاس سے نڈھال انسانیت کو سینے سے لگانے کی پر خلوص کاوشوں کو اپنے دل کی آواز سمجھنے لگتے ہیں۔ یہ بات الگ ہے کہ روسی سیاست ہر ایسی تحریک کو مدد دینے اور اسکی سرپرستی کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں مگر یہ بات ماننے کی ہے کہ اس کے اکثر ماننے والے نوجوان خلوص اور ضمیر کی کھٹک سے خالی ہوتے ہیں۔ روسی سیاست

کی ہی وہ نظریاتی قوت تھی جس کا مقابلہ یقیناً دنیا کی زوال آمادہ تہذیبی گرانٹ کی حامل اقوام صرف دولت کے بھروسے پر نہیں کر سکتی تھیں۔ مشرقی ملکوں کیلئے روس عالمی توازن حاصل کرنے کے لئے ایک اچھا سیاسی حربہ بھی تصور کیا جاتا رہا ہے۔ اور اس میں اس کی سائینسی اور ریاستی قوت کارفرما ہے۔ جسکی بنیاد پر وہ دنیا کی دو عظیم طاقتوں میں سے ایک ہے۔ ۱۹۴۷ء تک پاکستان کے اطراف عالمی سیاست کے دباؤ اور داخلی سطح پر اس کے نظریاتی بحران کی یہ صورت حال تھی جس میں پاکستانی قوم تعمیر نو کے پہلے مرحلے میں داخل ہو رہی تھی۔ قائد اعظم نے اس پیچیدہ صورت حال میں پاکستان کے لئے ایک متوازن لائحہ عمل کا انتخاب کر لیا تھا۔ مگر برطانیہ نے اپنے سیاسی ہتھکنڈوں سے اور اپنے پروردہ عناصر کے ہاتھوں اس منصوبے کو بروئے کار نہیں آنے دیا۔ اور پاکستان کو کلی طور پر امریکہ سے وابستہ کر دیا گیا۔

۱۹۴۸ء میں پاکستان عالمی سیاست میں نظریات کے فقدان کی طرف جس طرح بڑھ رہا ہے اس کی سرسری روئداد آپ کے سامنے ہے۔ مگر داخلی طور پر اسکی تصویر اس صورت حال سے بھی زیادہ بھیانک تھی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ پاکستانی قوم اور اس کے دس کروڑ افراد کی سیاسی تربیت صرف سات سال کی مدت میں نہیں ہو سکتی تھی۔ تحریک پاکستان جس طرح اور جن تاریخی لمحے میں شروع کی گئی اس کے لئے مناسب ترین موقع یہی تھا۔ مگر اتنی بڑی تحریک اور اس کے مقاصد کو جتنی وضاحت کے ساتھ پاکستان کے ہر فرد کے ذہنی، جذباتی اور سیاسی شعور میں رچنا بسنا چاہئے تھا اس کے لئے یہ مدت ناکافی تھی۔ دراصل مسلم لیگ کے آدرشی پیمانہ پر تحریک پاکستان کا بنیادی تصور ہر پاکستانی کے ذہن میں ایک اسلامی مملکت سے وابستہ تھا جس کے پیش نظر اسلام اور پاکستان دو الگ چیزیں نہیں تھیں۔ اس کے سیدھے معنی یہی تھے کہ پاکستان میں ایک عام آدمی جس آدرش اور تصور کو ایک نئی مملکت کی صورت میں ڈھلتا دیکھنا چاہ رہا تھا وہ اسلام ہی تھا۔ جس کی وجہ سے تحریک پاکستان کو تو پر لگ گئے۔ مگر اس میں وہ سیاسی شعور پیدا نہیں ہو سکا تھا جو اس آدرش کو زندہ رکھتا اور اس کو نظر انداز کرنے والے عناصر کی اہمیت کو سمجھنے کی قوت رکھتا۔ جس کا فوری خیال یہ نکلا کہ مرکزی شخصیت اٹھ جانے کے بعد ملک کے دونوں حصوں میں ایسے نام برائے نام رہ گئے جن کی سیاسی بصیرت پر پوری قوم کو بھروسا ہوا اور وہ خود ایک نئی قوم کی تشکیل اور اس کے فکری افق کی تعمیر کا کوئی واضح تصور بھی اپنے ذہن میں رکھتے ہوں یہاں تک کہ ان میں سے بیشتر کی شخصی اور سیاسی دیانت بھی قوم کی نظر میں مشکوک تھی۔ اس ناقص سیاسی شعور کی وجہ سے پاکستانیوں کے پاس سوائے اپنی امیدوں، آرزوؤں اور آدرش کے ان شخصیتوں کو اپنے اوپر اثر انداز ہونے کا کوئی طریقہ کار بھی نہیں رہا تھا۔ اگر عالمی سطح پر ایک غلط قدم اٹھانے کے بعد بھی داخلی طور پر قوم کی ذہنی اور آدرشی تربیت خلوص سے کی جاتی تو شاید یہ صورت حال اتنی جلد مکروہ ترین شکلیں تبدیل نہ کرتی۔ لیکن ہوا یہ کہ پاکستان کے تمام باشندوں کو ذہنی اور جذباتی طور پر مفلوج بنانے کا عمل ۱۹۴۸ء ہی سے شروع کر دیا گیا۔ جس کا یہ سب سے گھناؤنا پہلو سامنے آیا کہ حکومت اور عوام کے درمیان کوئی ربط اور ہم آہنگی پیدا ہونے کے بجائے یہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہو گئے اور بعد میں ان دونوں عناصر میں سے ایک ذہنی مایوسی اور شکست کا شکار ہو گیا جس سے بڑا نقصان کسی قوم کے لئے بھی اس سے زیادہ ممکن نہیں۔

اور اس کے نتیجہ میں ہمارے رہنماؤں نے حاکم کی حیثیت اختیار کر لی اور وہ عوام کی بزور تسخیر کرنے کے عمل میں مصروف ہو گئے اور ان پر فتح پانے کی اس جد و جہد میں ملک دو طبقوں میں تقسیم ہو گیا ایک حکومت کرنے والا طبقہ، دوسرا محکوم طبقہ — جس کی ذہنیت اس سے الگ نہیں رہتی جو آزادی سے پہلے سرکار برطانیہ کے حکام بالا دست اور عوام کے درمیان تھی۔ اس عمل کے لئے یہ ضروری تھا کہ عوام کے اس آدرش کو سب سے پہلے ضرب لگائی جائے۔ جس کے ذریعہ عوام اس فاصلے کو پاٹنے کی تمنا کر سکتے ہوں، قوت حاصل کرنے کی جد و جہد کر سکتے ہوں یا اس تقسیم کو بے اثر بنانے کی خواہش کر سکتے ہوں۔ یہ آدرش پاکستان میں صرف اسلام تھا۔ جس کو بہت چالاکی سے دھوکے اور منافقت میں تبدیل کر کے اس میں جسمانی، اور فرد کی خواہشات کو ابھرنے کا موقع دیا گیا اور اس میں مغرب کی زوال آمادہ تہذیبی عناصر کے تعیشات کو فروغ دینے اور پروان چڑھانے کا موقع دے گئے۔ عام خواہشات میں بہت سی چیزیں مشترک ہوا کرتی ہیں۔ اس افسوسناک سیاسی کھیل کے نتیجہ میں قوم خود اپنے آدرش سے دور ہٹتی چلی گئی۔ اور اس میں ایک اجتماعی منافقت نے گھر کر لیا۔ جو اس آدرش کی نفی کے لئے از خود کافی تھی۔

دوسری طرف شہری آبادی، نوجوان طبقہ اور طالب علموں میں اشتراکی آدرش کے جراثیم دیکھ کر کمیونسٹ پارٹی اور انجمن ترقی پسند مصنفین دونوں کو ممنوع قرار دیدیا گیا۔ جس کی وجہ سے یہ متبادل آدرش بھی سسک سسک کر دم توڑ بیٹھا۔ ایک مخلص قوم کی تعمیر سے دلچسپی رکھنے والی دور اندیش لیڈرشپ ان دونوں آدرشوں کو کبھی مرنے نہیں دے سکتی تھی۔ کیونکہ یہ دونوں آدرش، ان کی آویزش، ان کا ذہنی افق اور قوم کی تعمیر کا سب سے بنیادی عنصر بن سکتے تھے۔ اسلام پاکستان کے عوام کے لئے اتنی بڑی قوت تھی کہ ہندوستان کے صوبہ یوپی کی کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری مسٹر احمد نے پاکستان میں اشتراکیت کے فروغ کے امکانات کا جائزہ لینے کے بعد اپنی رپورٹ میں اشتراکیت کا مستقبل پاکستان میں بالکل تاریک بتایا تھا اور اس کا سب سے بڑا جواز یہ دیا تھا کہ جہاں کے بھوکے اور مفلس عوام سے روٹی کی بات کی جائے اور وہ خدا کی بات کریں وہاں اشتراکیت کے فروغ کا حال معلوم۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ان دونوں نظریات کو اگر باقی رکھا جاتا تو ان کی آویزش قوم کو کبھی ذہنی مایوسی کا شکار نہ بننے دیتی۔ جسکا انجام یہ ہوا کہ پاکستان کے دس کروڑ افراد ذہنی طور پر مفلوج ہو کر رہ گئے۔ وہ ایک بے منزل بے مقصد اور بے آدرش قوم بن کر رہ گئے۔ جن کے لئے اپنی ذاتی، نجی، خارجی اور جسمانی خواہشات ہی سب کچھ بن گئیں۔ جن کی ذہنی مصروفیت صرف یہ رہ گئی کہ وہ کیسے لندن و پیرس کے ننگے کلبوں کو اپنا آدرش اور مقصد حیات بنالیں۔ آدرشوں کے اس فقدان نے قومی سطح پر جو ناقابل تلافی نقصان پاکستان کو پہنچایا وہ یہ تھا کہ پاکستان کے دو بعید ترین گوشوں جن میں سوائے تحریک پاکستان اور اسلام کے علاوہ کوئی رشتہ اور ہم آہنگی پہلے ہی سے موجود نہیں تھی، اس کے بعد ایک سرے سے کوئی رابطہ ہی نہ رہا، جب مختلف عناصر کو متحد اور ہم آہنگ کرنے کا جوہر ختم کر دیا جاتا ہے تو ان کے درمیان اختلافات بالکل اسی طرح ابھر آتے ہیں جیسے کسی پختہ سڑک میں سے شدید بارش کے بعد گڑھے نمودار ہو جاتے ہیں۔ جس کا منطقی انجام یہ ہوا کہ صرف مشرقی اور مغربی پاکستان ہی نہیں بلکہ مغربی پاکستان کے مختلف صوبوں کے درمیان بھی یہ رشتہ ختم ہو گیا وہ صوبائی عصبیت کا شکار ہو گئے۔ (تقویٰ پاکستان)۔

آدرش، نصب العین سب خاک میں مل گئے تھے اور اُن میں سوائے ایک دوسرے سے نفرت، حقارت، تحریک پاکستان سے عدم دلچسپی اور تصورِ پاکستان کی تضحیک کے سوا کچھ باقی نہیں رہا۔ ایک گہرے تجزیئے کی روشنی میں اگر چند معاشی تحفظات اور بھارتی خطرہ نہ ہو تو یہ اتحاد ایک بھی مشترک عنصر کا پتہ نہیں دے سکتا۔

اس بیس سال کے عرصہ میں ہم اس منزل سے جس پر ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء تک تھے، کتنی دور آچکے ہیں۔ اس کا کوئی اندازہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ قیام پاکستان کے ابتدائی زمانہ میں رہنماؤں کو کم از کم ایک بات کا لحاظ ضرور تھا کہ خواہ اُن کی ذاتی کمزوریاں کیسی ہی کیوں نہ ہوں مگر وہ مسلمہ اخلاقی، اور ملی اقدار کا احترام دل سے ضرور کرتے تھے اور انھیں دہراتے رہتے تھے۔ مگر بعد میں ان اعلیٰ اقدار پر ذاتی خواہشات، مفادات اور شخصی اغراض کو اس طرح حاوی کیا گیا ہے کہ پاکستان میں اعمال اور افعال کا کوئی پیمانہ اور معیار باقی ہی نہیں رہا۔ اسی لئے ہر شخص اپنے ضمیر اور اجتماعی اقدار پر اپنے ذاتی مفاد کو ترجیح دینے میں ذرا بھی باک محسوس نہیں کرتا۔ قومی سطح پر یہ رجحان سب سے خطرناک رجحان ہے جو قوم کو اندر سے کھوکھلا بنا چکا ہے جس کے ذریعہ ہر شخص خود غرضی، منافقت اور چالاکی سے اپنے مفاد کو جائز قرار دینے کا جواز بھی تراش لیتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ ہر قسم کی ذمہ داری سے عاری ہو چکا ہے۔ اور یہی قومی کردار بن گیا ہے۔ کیا یہ ایک تاریخی حقیقت نہیں کہ مقاصدِ پاکستان اور تصورِ پاکستان کو بار بار کانوں اور قلب تک پہنچانے والی وہ آواز بھی بالآخر پچھلے دنوں مایوسی کے عالم میں دم توڑ گئی ہے۔ جس کے بعد اب قوم کے بے حس ضمیر کو شاید اب وہ ناگواری بھی محسوس نہ ہو جو اسے ہر ۱۴ اگست ہر ۱۱ ستمبر اور ہر ۲۵ دسمبر کو ہوا کرتی تھی۔

یہ اس حقیقت کا خود تنقیدی مگر سرسری جائزہ ہے۔ جس سے پاکستان کے لکھنے والے بیس سال ذہنی اور جذباتی طور پر گزرتے رہے ہیں۔ ہر لکھنے والا اپنی قوم کے جذباتی وجود میں برابر کا شریک ہوتا ہے اور ہیئتِ اجتماعی کی خواہشات اور تبدیلیاں اسے بھی متاثر کئے بغیر نہیں رہتیں۔ چنانچہ ہم اگر گذشتہ بیس سال کے ادب کا جائزہ لینے بیٹھیں تو ہمیں اس پس منظر کا ثبوت ہر قدم پر مل سکتا ہے۔ ادیبوں کی خواہشات بھی بدلتے ہوئے معاشرے سے ہم آہنگ ہوگئیں۔ اس کا سراغ بھی اقدار کی شکست میں مل سکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ لکھنے والا ایک عام آدمی کے مقابلے پر زیادہ آدرش پرست ہوتا ہے اور وہ بغیر کسی اعلیٰ قدر، بلند آدرش اور صحت مند تصور کے کچھ نہیں لکھ سکتا۔ خواہ یہ عمل خالصتاً انفرادی ہو۔ پاکستان کے ادیبوں کا آدرش اجتماعی خواہشات کے ساتھ بدل گیا۔ اس کے اتنی جلدی بدل جانے کی وجہ یہ تھی کہ لکھنے والوں کی اکثریت تحریکِ پاکستان اور تصورِ پاکستان سے ہم آہنگ نہ تھی ہر قوم کی تاریخ میں ایک لمحہ ایسا آتا ہے جب وہ کسی نصب العین یا بڑے آدرش کے لئے بیتابانہ اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ اور اس کا یہ سفر اتنا تیز رو اور ہنگامہ پرور ہوتا ہے کہ اسکی اجتماعی عملی جدوجہد کے سامنے ادیب کا قلم سست پڑنے لگتا ہے۔ تحریک پاکستان کی سات سالہ جدوجہد بھی ایک ایسی ہی شعلہ خیز تحریک تھی جس کا ساتھ قلم نہیں دے سکتا تھا۔ اور یہاں تو معاملہ یہ تھا کہ اُن میں سے بیشتر کا آدرش تصورِ پاکستان تھا بھی نہیں۔ لیکن جب وہ وقت آیا کہ پاکستان کی معنویت کا اظہار ادب میں ہو سکتا تو اس وقت تک قلم و ادب رہینِ ستم ہائے اربابِ سیاست ہو چکی تھی مگر یہ قصہ ۱۹۴۷ء کے بعد کا ہے۔ پہلے تو ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ قیام پاکستان کے وقت ادیبوں کا طبقہ کیا سوچ رہا تھا۔ جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ ادیب

قوم کے جذباتی وجود میں برابر کا شریک ہوتا ہے۔ مگر پاکستان میں تحریک پاکستان کے سلسلے میں ادیب کا جذباتی وجود اپنی قوم سے الگ ہوگیا تھا اور ان کی بیشتر تعداد آزادی سے قبل کے مشترک رویہ کو بدلنے کی کوئی کاوش نہیں کر سکی تھی۔

پاکستان میں بھی ۱۹۴۷ء سے قبل کی طرح ادیبوں کا تعلق صرف شہری آبادی سے تھا۔ نئے آنے والوں نے بھی اپنا مسکن شہروں کو بنایا۔ جس کی وجہ سے لکھنے والوں کا رابطہ پاکستان کی اصل آبادی کے جذباتی تانے بانے، ذہنی عمل اور معاشرتی مسائل سے پیدا نہیں ہوسکا تھا ۔ جس کی وجہ سے یہاں پیدا ہونے والا نیا ذہن بجائے پھیلنے کے سکڑنے لگا۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے کم ازکم ادب میں ایک آدرش اور نصب العین ہونے کی وجہ سے خواہ وہ رومانی اور غیر حقیقی ہی ہو مگر عوام کی زندگی اور اس کے مسائل کا ذکر ضرور کیا جاتا تھا۔ مگر آزادی کے بعد تو اس کا ذکر نہ کرنا ہی ادب کی سب سے بڑی خصوصیت بن گیا تھا۔ اس طرح پاکستان میں شہری ادیبوں کا ایک ایسا طبقہ وجود میں آیا جو پاکستان کو صرف شراب کے پیالوں اور کافی اور چائے کی پیالیوں میں دیکھ کر مطمئن ہوجاتا تھا اس میں کوئی شک نہیں اس رویہ کی پیدائش کا سبب ادب کے دونوں تصورات کا بے اثر ہوجانا تھا۔ اس کا ثبوت اس حقیقت سے بھی ملتا ہے کہ پاک و ہند کے تمام لکھنے والوں نے آزادی کے فوراً بعد فسادات کے تجربات کے لیے خود کو وقف کر دیا۔ اس میں یقیناً انسان کی بہیمیت کے اس ہولناک تجربے کا عمل دخل تھا مگر اس میں ایک اور حقیقت بھی کام کر رہی تھی۔ دراصل ادیب آزادی کے بعد دونوں آدرشوں کی موت کا ماتم بھی کر رہے تھے۔ رومانی ذہنیت اور تصوراتی فکر جب کسی حقیقت سے ٹکرا کر پاش پاش ہوجاتی ہے تو اس کا نتیجہ آہ و بکا ہی نکلتا ہے۔ فسادات کا ادب اور اس کا ایک عہد دراصل رومانی ذہنیت کا نوحہ ہے۔ جس میں وہ ہر چیز کو ایک فیشن، سیاسی ہلچل اور ذاتی شہرت اور تسکین کے لئے اختیار کئے ہوئے تھے۔ ۴۷ء ادب کی ہنگامہ خیزی اور آدرش پرستی کے نقطۂ عروج پر آزادی کے بعد کی مایوسی اور شکستگی کا ایک عجیب موڑ ہے۔ اگر للکارتا ہوا لہجہ چند ماہ میں ڈھ جائے تو اس سے یہ فوراً معلوم ہوجاتا ہے کہ للکارتا ہوا لہجہ اصلی نہیں تھا۔ خواہ آپ اس کا تجزیہ کسی طور بھی کریں مگر یہ بات بہرصورت قابل ذکر رہتی ہے کہ اگر تنظیمیں ختم کردی گئی تھیں تو انفرادی طور پر انھیں اپنے اپنے پسندیدہ موضوعات پر ضرور لکھنا چاہیے تھا چنانچہ فسادات کے ادب کے بعد اکا دکا ادیبوں نے پاکستانی اور اسلامی ادب کا نعرہ ضرور لگایا تھا۔ اور بعض ترقی پسندوں نے بھی اپنے موضوعات پر دوبارہ طبع آزمائی کی تھی۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آزادی سے قبل کے ادب کے موضوعات بھی پڑھنے والے اور لکھنے والوں دونوں کے لئے بے معنی ہوچکے تھے۔ تحریک پاکستان اپنے ساتھ لکھنے والوں کی کوئی منظم تحریک پیدا نہ کر سکی اور ترقی پسند مصنفین پر پابندی لگ گئی تو گویا تنظیم کے بغیر ادب پیدا نہیں ہوتا ہے چونکہ خود ادبی تنظیم کی پیدائش ہی پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم کے دوران ہوئی تھی۔ ورنہ اس سے پہلے دنیا میں کبھی لکھنے والوں نے کوئی تنظیم قائم نہیں کی تھی۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۰ء تک کے پاکستانی ادب کے مطالعے سے یہ بات بالکل ظاہر ہوجاتی ہے کہ پاکستان میں تنظیموں کا دور ختم ہوچکا تھا۔ اور صرف یہاں نہیں بلکہ ساری دنیا میں اس سے قبل ہی تنظیموں کے خلاف انفرادی

تخلیقی شعور کا احیاء ہوچکا تھا۔ اس عہد میں پاکستان کا سارا ادب شدّت سے انفرادی طرزِ فکر کا اظہار کرتا ہے۔ تنظیموں کی اس پسپائی کا ایک بہت بڑا سبب بین الاقوامی سطح پر اشتراکی نظریے کے زوال کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ اشتراکی نظریہ کی کامیابی میں روس کی نظریاتی ریاست کے استحکام کو بہت بڑا دخل رہا ہے۔ اور اس ابتدائی زمانے کو چھوڑ کر دنیا بھر کے لکھنے والوں کو روس کی آمریت، جبری نظریۂ حیات اور انفرادی آزادی کے خاتمے کے ستم کا انکشاف۔ خاصی الجھن میں مبتلا کرتا رہا تھا مگر اس زمانے تک آتے آتے روس سیاسی حیثیت سے بھی چند ٹھوکریں کھا چکا تھا اور دنیا کے سامنے اس کی ایک استعماری ذہنیت بھی آشکارا ہوچکی تھی۔ اس کے ساتھ ہی نوآزاد ملکوں میں قوم پرستی کی تحریکات کی کامیابی نے اشتراکی نظریہ کی مقبولیت پر کافی ضرب لگائی تھی۔ اور مختلف نظریاتی تحریکوں نے اشتراکیت کا بازار ٹھنڈا کر دیا تھا اتفاق سے مسلمانوں کی تحریک آزادی کا سب سے مقبول نظریہ اسلام تھا جو خود ایک آدرشی نظام رکھتا ہے۔ جس کو آزادی کے بعد اولیت حاصل ہوگئی یہ بات الگ ہے ان ممالک کا حکمران طبقہ خود اسے اپنے لئے خطرہ سمجھنے لگا ہو۔ پاکستان میں بھی انفرادی شعور اور تخلیقی انفرادیت کے پھلنے پھولنے میں یہ اسباب کام کر رہے تھے جس کی وجہ سے اشتراکی نظریہ تخلیقی عمل میں بھی گہرائی کے ساتھ پیوست نہ ہوسکا۔ ۱۹۵۸ء کے بعد پاکستان میں حکمران طبقہ کی مصلحتوں کے پیش نظر مغرب کی زوال آمادہ تہذیبی روایات اور خواہشات کے مظاہر مقبول ہونے شروع ہوئے اور ادب میں بھی وہاں کی جدید تر ادبی تحریکات متبادل طرزِ فکر کی صورت میں مقبول ہونی شروع ہوئیں۔ یہ متبادل طرزِ فکر بین الاقوامی سطح پر سوچنے کا عمل تھا۔ ویسے تو یہ ایک خوش آیند طرزِ فکر تھا مگر جن حالات میں وہ شروع ہوا تھا اس نے ادب کو اس کی رہی سہی انفرادیت سے بھی محروم کر دیا۔ پاکستانی ادیب ابھی اپنے پڑوس اور گلی سے بھی اپنے رشتہ اور روابط پیدا نہیں کر سکا تھا کہ اسے دنیا کے اربوں انسانوں، مختلف نظریہ ہائے حیات، مختلف ممالک اور ان کے طرزِ احساس کے درمیان اپنی جگہ تلاش کرنے کی دھن لگ گئی۔ جو صلاحیت اپنے ملک اپنے شہر اپنے محلّے کی تصویر کشی نہ کر سکتی ہو وہ بین الاقوامی روح، عالمی رنگ اور وسیع تر تخلیقی امکانات پر کیا طبع آزمائی کر سکتی تھی اس کا انجام معلوم۔ لہٰذا ایسا ادب اور شاعری پاکستان بھر میں ایک فیشن بن گئی جو بے رنگ بے روح تھی اور جس کے کسی پہلو اور رُخ کا تعلق پاکستان کی باطنی گہرائیوں اور شخصیت سے نہیں تھا۔ شہر کے چند نوجوانوں اور بوڑھے ادبی اجارہ داروں کی بے شوری اور تخلیقی عمل سے ناآشنائی نے ادب کو جذبوں کے رنگوں سے بھی محروم کر دیا۔ جب روس نے پہلا اسپٹنک فضا میں اڑایا تو مغرب پر اس کی فوقیت کے سبب پاکستان میں لکھنے والوں کے ایک طبقہ نے ایک بار پھریری لی۔ مگر یہ بھی ایک سیاسی طاقت کی فتح کا نشہ ثابت ہو کر رہ گئی اور چند دن میں یہ حرارت بھی باقی نہ رہی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ لکھنے والوں کو یہ پتہ نہیں تھا کہ روس کا جدلیاتی نظریہ خود ایک "جدلیت" سے گزر رہا تھا۔ یہ انھیں اسٹالن کی موت کے بعد پتہ چلا کہ اسٹالن کا "اجتماعی اشتراکی مفاد" خروشیف کے "انفرادی روسی مفاد" میں بدل چکا ہے۔ اور پھر روس پر بدحواسی کے پئے در پئے حملے ہوئے اور اس کا انجام یہ ہوا کہ وہ روس جو اسپٹنک اڑا کر بعض حلقوں میں دنیا کی سب سے ترقی یافتہ سائنسی قوت بن چکا تھا۔ اچانک امریکہ سے غلّہ خرید بیٹھا۔ یہ معمولی سا واقعہ کس

عظیم تر حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے اس کو جدید دنیا کا مورخ ۱۹۱۷ء کے بعد جدید دنیا کے ہیرو روس کے سیاسی زوال کا بنیادی نقطہ اور ثبوت قرار دیگا ــــ اس کے ساتھ ہی روس سیاسی طور پر اپنا اعتبار اور اپنی آدرشی قوت کھو بیٹھا ہے۔ اردو ادب ایک بے منزل سفر پر قانع ہے۔ جس میں انفرادی لیکن منفعت، اخباری شہرت بہ مع رنگین تصویر، تخلیقی عمل سے زیادہ اہمیت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ ادب کو سنجیدہ مشغلہ ماننے والے اپنے سامع اور قاری کو کتاب پڑھنے کی زحمت سے بھی بچا کر خالص تفریحی سطح پر لے آئے ہیں اور دیوان غالب کی اشاعت پر توجہ دینے سے زیادہ اس کے پرزے اُڑانے کے لئے ناٹک دکھا رہے ہیں آزاری سے تقریباً، سال بعد آدرشوں کے فقدان کا ردعمل اب شروع ہوا ہے۔ مگر اردو ادب میں ایک صحت مند رجحان بھی پیدا ہوا ہے اور وہ ناول نگاری ہے۔ پچھلے چند سالوں میں دو تین ایسے ناول لکھے گئے ہیں جو قابل ذکر ہیں ان کو پڑھنے کے بعد یہ آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہمارے معاشرہ کا نوحہ ہیں۔ جن میں ان ہی اقدار کے خاتمہ پر ماتم کیا گیا ہے جس سے گزر کر اردو ادب اخباری کالموں تک پہونچ گیا ہے۔

بیس سال کے اس ادبی پس منظر اور اس کے بدلتے ہوئے بنیادی رجحانات کے اس مختصر جائزے سے صرف یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ پاکستان کا ادب اجتماعی اور انفرادی آدرش، نصب العین تخلیقی صداقت اور تحریر کی وقعت سے تہی ہو چکا ہے۔ ایک بنتے ہوئے معاشرہ میں اگر معاشرتی صداقتوں اور آدرشوں کا بیج مار دیا جائے تو پھر وہ اندر سے سکڑنے لگتا ہے اور اس کی تمام صلاحیتیں منتشر ہو جاتی ہیں۔ خدا جانے انھیں دوبارہ کیسے پیدا کیا جا سکتا ہے مگر اس کی فکر ہمارے معاشرہ کو کیوں ہو اور کس لئے ہو؟؟

مرتبہ :- اکرام احمد

سنہ ۱۹۶۷ء کی اردو مطبوعات

تنقید اور تجربہ ادب و تنقید مصنف :- جمیل جالبی ناشر :- مشتاق بک ڈپو، کراچی ع۱

مضامین سرسید " " سرسید احمد خاں مرتبہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار " :- مکتبۂ خیابان ادب، لاہور

انشائیے " " فضل احمد صدیقی " :- آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی ۱۸

تاثرات و مشاہدات " " انیس فاطمہ بریلوی " : " " " "

انوارِ اقبال اقبالیات مرتبہ بشیر احمد ڈار " اقبال اکادمی پاکستان، کراچی ۷۹

روح اسلام کی نظر میں " مصنف ڈاکٹر غلام عمر خاں " صفیہ اکادمی، کراچی ع۵

آئینہ اقبال " مرتبہ محمد عبداللہ قریشی " آئینہ ادب لاہور

کلیات ذوق شعر و شاعری مصنف :- محمد ابراہیم ذوق دہلوی مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی ناشر :- مجلس ترقی ادب، لاہور

نجوم و جواہر " " شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی ناشر :- جوش اکادمی، کراچی

جنون زارِ خیال " " میجر محمد عاشق " عارف پبلی کیشنز، لاہور

خون آہنگ " " نعیم صدیقی " مکتبۂ کارواں، لاہور

پھر ایک کارواں لٹا " " " " ادارۂ مطبوعات طلبہ، کراچی

مجاز ایک آہنگ (نیا ایڈیشن) فن و شخصیت " مختلف اہلِ قلم کے مضامین کا مجموعہ " مکتبۂ افکار، کراچی ع۱

عزیز بھٹی شہید سوانح " اصغر علی گھر وال " مکتبۃ الوکیل، گجرات

تاریخ طبری جلد دوم تاریخ " ابی جعفر محمد بن جریر الطبری ترجمہ محمد ابراہیم ندوی ناشر نفیس اکادمی، کراچی ع۱

اسلام اور انسانی قانون قانون " عبدالقادر عودہ شہید ترجمہ عمر بن عبداللہ " صفیہ اکادمی، کراچی ع۵

تدریس نسخ تاریخ رسم الخط " عبدالقیوم " آزاد بک ڈپو، لاہور

مخطوطات تاریخی (پاکستانی ایڈیشن) کتابیات " حکیم شمس اللہ قادری " واحد بک ڈپو، کراچی ع۲

فتح او قیانوس مہمات " ہائی اسٹریمین۔ گگن ڈی کٹلر مترجمہ آفتاب احمد سہیل ناشر :- اردو اکادمی سندھ، کراچی ۱

اسلام اور آزادی (نیا ایڈیشن) مذہب " ابوالکلام آزاد ناشر :- سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

لڑکی ایک دل کے ویرانے میں ناول مصنف رشیدہ رضویہ " شیش محل کتاب گھر، لاہور

کہاں ہے تو " " اختر سلیمی " مکتبۂ حسن کار، لاہور

دروازے سے گا دبے پاؤں افسانے " ذکاء الرحمن " مکتبۂ میری لائبریری، لاہور

یہ سلسلہ وار فہرست صرف ان کتابوں پر مشتمل ہے جن پر سن اشاعت سنہ ۱۹۶۷ء چھپا ہوا ہے۔

رخشان ابدالی

مسدّس احقر

مسجد مچھلی بازار کان پور کی شہادت کا حادثہ، انگریزوں کے دورِ حکومت ہند کا بہت بڑا اور مشہور تاریخی واقعہ ہے، جو ۱۹۱۳ء کا المیہ ہے، صرف ایک سڑک کے درست کرنے کی خاطر، نہ صرف کان پور شہر بلکہ پورے ہندوستان کے مسلمانوں کی عرض و استدعا ٹھکرا کر ان کے جذبات مذہبی و احساساتِ ملی یکسر نظر انداز کر کے مسجد کے ایک حصے کا انہدام، بظاہر ایک عمارت کا جزوی طور پر ٹوٹنا نہ تھا بلکہ مسلمانان ہند کے دلوں کو توڑنا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ واقعہ ہندی مسلمانوں میں ایک بڑے ہیجان کا سبب بنا اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مسلمانانِ ہند کی سیاسی بیداری میں حادثہ کانپور کو بڑا دخل ہے۔ مولینا محمد علی کے "ہمدرد" اور "کامریڈ" کی آتش بار تحریریں، "الہلال" کا مشہد اکبر جیسا شعلہ بار مقالہ، خواجہ حسن نظامی کا "کہو تکبیر" کا نعرہ اور علامہ شبلی نعمانی کی نظمیں اس حادثے کی یادگار اور اس دور کے تبرکات ادبی ہیں۔ مولانا شبلی کی نظم کا مصرع

"مساجد کی حفاظت کے لئے پولس کی حاجت ہے"

اور ع "ہم کشتگانِ معرکہ کان پور ہیں" کی صدائے بازگشت ایک عرصے تک گاؤں گاؤں میں سنی جاتی رہی

حضرت احقر بہاری نے بھی اس حادثے سے متاثر ہو کر ۱۶ بند پر مشتمل ایک مسدس لکھا جس کے متعلق طرح طرح کی افواہیں سنی گئیں، کسی نے کہا مسدس ضبط ہو گیا، مگر ان کے ایک عزیز قریب سے جو معلوم ہوا اس کا ماحصل یہ ہے کہ مقدمہ چلا، اور صرف ایک سال کے لئے مچلکا ہوا، اور کسی مجمع میں کلام سنانے کی پابندی ایک سال کے لئے عاید کردی گئی ــــ اب یہ مسدس "قومی زبان" کی وساطت سے ارباب ذوق کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

شاعر کے حالات پر راقم کا ایک مقالہ بعنوان "حضرت احقر بہاری" "قومی زبان" ہی کی اشاعت ۲۲ دسمبر ۶۴۸ء میں اور ایک اور مقالہ ماہ نامہ "مہر نیمروز" کراچی ماہ اگست ۶۰ء میں شائع

ہو چکا ہے اس لئے حالات پیش کرنے کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔

"تذکرۂ ضیغم" نیز مقالہ مطبوعہ معارف اعظم گڑھ ماہ رجب ۵۲ ۱۲ھ اور جناب معین الدین دردائی کے تذکرہ "بہار اور اردو شاعری" اور "تذکرۂ مسلم شعرائے بہار" مولفہ مولٰنا سید احمد اللہ ندوی صاحب مطبوعہ کراچی میں حضرت احقر کا تذکرہ ملتا ہے۔

بلبل وہ ہوں کہ وقفِ خزاں ہے چمن مرا کنجِ قفس مجھے ہے ریاضِ وطن مرا
زخمی ہے تیغِ ظلم و ستم سے بدن مرا شاہد ہے میرے خون پہ خونیں کفن مرا
سنتا ہے کون، کس سے کہوں، کیوں ملول ہوں
ہیں اردگرد خار مرے، میں وہ پھول ہوں

چلتی ہے باغ دہر میں صرصر، نسیم غم ہیں لاکھ بانیانِ ستم، اور ایک ہم
ہے وقتِ آزمائش خلاقِ ذوالکرم ڈگنے نہ پائیں دیکھ دلِ ناتواں! قدم
ہر حال میں نگاہ رہے امتحان پر
کٹ جائے سر تو شکر ہو جاری زبان پر

سن سن کے حالِ مسجد مشہور کانپور ٹوٹا پہاڑ غم کا ہوا قلب چور چور
کس درجہ عدل و داد سے حکام ہیں نفور ظالم تلاش کرتے ہیں مظلوم کا قصور
اللہ یہ سلوک رعیت کے ساتھ اوہ!
کمزوریاں دکھاتے ہو طاقت کے ساتھ اوہ!

اے ظالمو خدا کے لئے کچھ کرو تو غور کمزور پر یہ زور، یہ سفاکیاں، یہ جور
کیا عادلوں کی شان یہی ہے؟ یہی ہے طور مسجد کے توڑنے کے سوا تھی نہ راہ اور؟
سوچو اگر تو تم سے بڑا کام رہ گیا
نوشیرواں نے عدل کیا، نام رہ گیا

مسجد گرائی، خون بہایا، غضب کیا زخمی قلوبِ اہلِ وفا بے سبب کیا
اچھا علاج یہ دلِ درماں طلب کیا کرنا نہ تھا جو ظلم غریبوں پہ سب کیا
ہم پر تو ایک وقت تھا آیا نکل گیا
لیکن ہزار شکر کہ موسم بدل گیا

ناحق دکھائے تم نے دل ان مسلمین کے — جو کٹ پہ گھس کے خط جو شائیں جبین کے
روندا ہے تم نے پاؤں سے دل چھین چھین کے — مالک تھے ایک روز ہمیں اس زمین کے

رکھتا چھپا کے داغ دلِ داغدار کا
ہوتا جو کچھ بھی جبر مرے اختیار کا

لیکن اب اختیار سے باہر ہے دل مرا — ہے رنج و غم سے قلب بہت منفعل مرا
آنکھوں سے بہہ رہا ہے لہو متصل مرا — اب بھی مگر گلے سے ہے دل منفعل مرا

انصاف خود بتائے گا کس کا قصور ہے
ضد حاکموں کی شانِ حکومت سے دور ہے

پوچھا جو تم نے آج یہ کیوں اژدہام ہے — کی عرض سب نے بس ہمیں مسجد سے کام ہے
حاکم سے سرکشی نہ کریں گے حرام ہے — ہم میں کا فرد فرد تمہارا غلام ہے

یہ کہہ کے لب پہ سینے سے فریاد آگئی
گولی چلی تو شانِ خدا یاد آگئی

غل تھا کہ مومنوں پہ چلیں برچھیوں کے وار — پیدل کی بھی قطار اِدھر اُس طرف سوار
ہر سو یہی صدا تھی، یہی ہر طرف پکار — واجب ہے آج قتل ہوں فرضی گناہگار

فرماد منصفی سے، یہ طرزِ دغا ہے کیا
بچے پکارتے تھے ہماری خطا ہے کیا

اے کشتگانِ خنجرِ تسلیم کانپور — دیتی ہے اک سبق ہمیں تعلیم کانپور
کچھ خاص ہو گئی ہے جو تکریم کانپور — اب مومنوں پہ فرض ہے تعظیم کانپور

قسمت سے تم سبھوں کو یہ تقدیر مل گئی
ہو کر شہید، خُلد کی جاگیر مل گئی

ہاں بسملانِ تیغِ ستم کانپور! ہاں — دو امتحان آج کہ ہے وقتِ امتحاں
کچھ روز اور جھیل لو زنداں کی سختیاں — رہتا ہے ایک حال پہ کب دورِ آسماں

تھے تاج کی ہوس میں جو سر تلے گیا ہوئے
قبضہ تھا جن کا تیغ پہ کل، آج کیا ہوئے

کچھ دل میں تم خیالِ عقوبت نہ لائیو ۔ آساں ہیں بیڑیوں کی کڑی جھیل جائیو
ہو کر ضعیف قوم کی قوّت بڑھائیو ۔ تم عاجزی میں شانِ تکبّر دکھائیو

احساں تمہارا حشر تک اب قوم پر رہا
سہرا رضائے حق کا شہیدوں کے سر رہا

اللہ یہ نصیب تمہارے یہ قسمتیں ۔ یہ حوصلے بلند یہ مردانہ ہمتیں
دیتی ہیں امرِ حق کی شہادت شہادتیں ۔ پہچانتی ہیں اہلِ ستم کو عدالتیں

افسوس ہم تڑپتے ہیں دنیائے زشت میں
تم اب مزے اڑاتے ہو باغِ بہشت میں

اب تم ہو اور سیرِ جناں ہے زہے نصیب ۔ حوریں ہیں تخلیے کا مکاں ہے زہے نصیب
ہر سو چمن میں نہر رواں ہے زہے نصیب ۔ گلچیں کا ڈر نہ خوفِ خزاں ہے زہے نصیب

جوبن ہے گلرخانِ چمن پر شباب کا
کیا فضل ہے کہ خوف نہیں انقلاب کا

ہر جا نئی بہار ہے، ہر سو نیا سماں ۔ طاؤس کا وہ رقص، پپیہے کی پی کہاں
گل کا فسانہ بلبلِ نالاں کو بر زباں ۔ کوئل کی کوک نشترِ رگہائے روح و جاں

جو جو پرند داخلِ دار السلام ہے
سینوں پہ سب کے نقشِ محمدؐ کا نام ہے

تم بھی جو دل پہ نقش کرو مصطفیٰؐ کا نام ۔ بگڑے ہوئے ہزار بنیں ایک دم میں کام
دوزخ سے ہو نجات، ملے خلد میں مقام ۔ اللہ رے نام شافعِ کل، سیدِ انام

جو طیر ہے وہ تیغِ ولا سے ہلاک ہے
جاری زباں پہ نعرۂ "روحی فداک" ہے

وہ صورتیں طیور کی، وہ انکے رنگ ڈھنگ ۔ نغموں میں دلفریبیاں، رفتار میں اُمنگ
دیکھے بشر تو دیکھ کے ہو جائے عقل دنگ ۔ اے تیری شان، ایک کلی میں ہزار رنگ

وہ ان کی ضَو وہ ان کے جواہر نگار پر
آتا ہے وجد صنعتِ پروردگار پر

ہر سمت طائروں کی ہر اک کیا ہزار قسم   سادہ کسی کا پر متلوّن کسی کا جسم
تم تم کے "یا قلیل" کا رٹتا ہر کوئی اسم   جنّت کا باغ ہے بخدا گلشنِ طلسم
دیکھے کبھی طیور نہیں اس طریق کے
منقاریں لاجورد کی، پنجے عقیق کے

روشن وہ بال و پر وہ منوّر کلی کلی   مقیش کو نصیب کہاں یہ جھلا جھلی
ہر عضو صورتِ دُرِ خوش آب منجلی   لکھا ہوا وہ نام خُدا بعض پر جَلی
سامان یہ کہاں اُمرا کے مکانوں میں
طوبیٰ کی پتّیوں کے وہ فرش آشیانوں میں

ہر شاخِ نخل پر وہ پرندوں کے چہچہے   اُڑ جائیں سن کے ہوش بشر کے رہے سہے
دل کی یہ آرزو کہ انھیں دیکھتا رہے   آئے نہ کچھ سمجھ میں تو انسان کیا کہے
وہ جھٹ پٹے کا وقت وہ عالم سرور کا
طاؤس کا وہ غل وہ چہکنا طیور کا

اُڑتے تھے طائرانِ سبک رو اِدھر اُدھر   گرتا تھا صحنِ باغِ جناں میں تمام زر
یاقوت کی زبان، زمرّد کے بال و پر   وہ گردنیں بلور کی، وہ کہربا کے سر
خیرہ نظر تھی دیکھ کے رنگ آب و تاب کا
دھوکا کلی کلی پہ گُلِ آفتاب کا

ہر جا نسیمِ صبح کا اک خاص اہتمام   باہر جائے نکہتِ گُل، اسکی روک تھام
حوروں کا جمگھٹا کہیں رضواں کا ازدحام   مومن کو سیرِ گلشنِ جنّت کا اذنِ عام
آلام و درد و دُکھ دلِ دردمند سے
آزاد سرد باغِ خزاں کے گزند سے

غنچوں کا رنگ اور تھا، پھولوں کا رنگ اور   بلبل گلوں کو چھیڑ کے کرتی تھی تنگ اور
نرگس تھی چشمِ حور سے کچھ شوخ و شنگ اور   رفتار کا نسیمِ گلستاں کے ڈھنگ اور
اُبھری کی پتّیوں میں گُل یاسمن کی بو
سوسن کے پھول دیتے تھے مشکِ ختن کی بو

سبزہ لہک رہا ہے عجب آب و تاب سے — گل کی قبا بسی ہوئی عطرِ گلاب سے
ہر سو چمن میں بارشِ رحمت سحاب سے — حیران بشر ترے کرم بے حساب سے

کیا دل شہید راہِ خدا اب ہرا ہوا
پایا گلِ مراد سے دامن بھرا ہوا

مرغانِ باغِ خلد کسی سمت نغمہ خواں — دلکش وہ حُسنِ صوت وہ چلتی ہوئی زباں
پہنچے چہک چہک کے یہاں سے کبھی وہاں — چونکے ہوا سے نخل کی جھنڈ میں جو ڈالیاں

کھٹکا ہوا جو دل میں تو ہشیار ہو گئے
وحشت بڑھی تو اڑنے کو تیار ہو گئے

ان کا کبھی اِدھر سے اُدھر آ کے بیٹھنا — کر بال میں پَروں کو وہ پھیلا کے بیٹھنا
موقع وہ زیرِ نخل کبھی پا کے بیٹھنا — سب سے جُدا کسی کا الگ جا کے بیٹھنا

کوئی اُڑا ہوا میں پر و بال کھول کر
وہ رہ گیا پَروں کو کوئی تول تول کر

وہ بلبلانِ گلشنِ فردوس کی صدا ہیں — وہ بے خزاں بہار، وہ راحت فزا فضا ہیں
دستِ ہوس عنادلِ مشتاق گر بڑھائیں — بولیں چٹخ چٹخ کے یہ غنچے کہ ہم ہیں ہائیں

آ ہوش میں، حواس پکڑ، کچھ خبر بھی ہے
اے بے خبر بغل میں نسیم سحر بھی ہے

خوانِ کرم میں گلشنِ فردوس کے نہال — جھک جھک گئی ثمر سے ہر ایک ڈال
میوؤں کے توڑنے کا جو پیدا ہوا خیال — خود آ گئے قریب زہے شانِ ذوالجلال

تاکا اسے جو تاک نظر دور آ گئی
بس کھنچ کے سامنے مئے انگور آ گئی

وہ میوہ ہائے باغِ جناں فردِ بے عدیل — وہ سیب، وہ انار، وہ خرما، وہ ناجیل
وہ آبِ صافِ کوثر و تسنیم و سلسبیل — شکلیں وہ بن گئی ہیں مثلث و مستطیل

یہ نعمتیں یہ سیرِ جناں بے عمل نہیں
کہتا ہے کون نخلِ شہادت میں پھل نہیں

سونے کے وہ مکان وہ انکی چمک دمک — جنکو کبھی نہ دیکھ سکا دیدۂ فلک
کرتے ہیں ان میں سیر بشر صورتِ ملک — ہٹتی نہیں ہے آنکھ جھپکتی نہیں پلک

ممکن نہیں جو عیش امیروں کے واسطے
سامان وہ وہاں ہیں فقیروں کے واسطے

بوتل بھری ہوئی وہ شرابِ طہور کی — جامِ بلوریں وہ ضیا شمعِ طور کی
ہر قصرِ باغِ خلد ہے تصویر نور کی — نہریں رواں ہیں رحمتِ رب غفور کی

وہ غنچوں کے ٹھاٹ وہ انداز ناز کے
صدقے ہم اپنے ساقیِ مے کش نواز کے

حوروں کا بار بار یہ کہنا کہ آؤ آؤ — موجود میوہ ہائے بہشتی ہیں کھاؤ آؤ
وسواس میری جان اب دل میں نہ لاؤ — مشتاقِ دید کو نہ زیادہ ستاؤ آؤ

اب حال کیا بتائیں دلِ بے قرار کا
اللہ رے کسی کو نہ روگ انتظار کا

تھا کب سے اشتیاق مرے دل کو دید کا — شعبان بن گیا ہے مجھے روز عید کا
موقع ملا ہے غیب سے گفت و شنید کا — اللہ رے نصیب تمہارے شہید کا

حوروں سے یہ کلام یہ راز و نیاز ہیں
قسمت پہ اپنی آج شہیدوں کو ناز ہیں

آئے نہ کچھ سمجھ میں ستم ہائے آسماں — دو گز زمیں کے واسطے یا رب یہ سختیاں
لیکن کبھی تو ہوگا جفا کار مہرباں — جائینگی کوششیں نہ ہماری یہ رائیگاں

مسجد یہ پھر بنے گی جو فضلِ خدا ہوا
ٹیلر سے لغزشیں جو ہوئی ہیں تو کیا ہوا

حق کی طرف سے مظہرِ حق کا ہوا ظہور — لو آگیا وہ پاس ہوا غم دلوں سے دور
ہمت بلند، بخت جواں، آدمی غیور — ذی عقل و ذی فراست و ذی فہم و ذی شعور

تقریرِ فاضلانہ سنی جب نکات پر
فرزانگی نثار ہوئی بات بات پر

وہ دبدبہ، وہ چہرۂ تاباں پہ رعب داب — تھرائے آسمان جو دیکھے یہ آفتاب
ہے درد قوم سے جو بغل میں جگر کباب — آنکھوں میں اشک ہے، دل مضطر میں اضطراب

حُسنِ عمل پہ رنگ وہ حُسنِ شباب کا
گلشن کی جان ہے یہ شگوفہ گلاب کا

حکام وقت سے جو ملا کورٹ میں وہ شیر — سینے پہ داغ قوم کا پہلو میں دل دلیر
باطل کے دور کرنے میں حق کو لگی نہ دیر — بولا یہ سب ہوئے ہیں زبردستیوں سے زیر

ثابت ہے جب یہ فعل بغاوت سے دور تھا
ہر آدمی، جو عذر کرے بے قصور تھا

اب اس کو کیا سنائیں جو آیا ظہور میں — مجرم میں فرق تھا نہ یہاں بے قصور میں
جھگڑے میں ہوتی تھی عجب کان پور میں — حکام مست اپنے شرابِ غرور میں

سب جانتے ہیں ہم پہ جو ظلم و ستم ہوئے
لیکن مزا یہ ہے کہ گنہگار ہم ہوئے

زیبا نہیں ہے تاج کو یہ غیظ یہ غضب — یہ ان کا حال جن کا وفادار ہے لقب
رکھے گئے ہیں لا کے یہ زنداں میں بے سبب — معصوم گر نہیں ہیں تو محفوظ سب کے سب

جرم تمرّدی سے نفوس ان کے پاک ہیں
یوسف کی شکل دامنِ عصمت میں چاک ہیں

مجرم نہیں، خطا سے بری ہیں یہ بے گناہ — مخلص ہیں، بے ریا ہیں مسلماں، خدا گواہ
ہے جاں نثاریوں میں کسے ان کی اشتباہ — بہتان ایسی قوم پہ، اللہ کی پناہ

آئے تھے عذر کرنے کو مسجد کے باب میں
بیٹھے بٹھائے پڑ گئے شاہی عتاب میں

کہرام وہ مچا ہے گھروں میں کہ الاماں — بسمل کسی کے غم میں کوئی، کوئی نیم جاں
کہتا ہے اک ضعیف یہ لے لے کے ہچکیاں — "بیٹا! تمہیں لگا ابھی چھٹا سال چودھواں

جانا تھا والدین کے یوں دل نہ توڑ کے
اس بن میں تم سدھار گئے ساتھ چھوڑ کے

آجاؤ میری گود میں میں تم پہ پھر نثار لگ جاؤ آکے سینۂ سوزاں سے ایک بار
ہوتا ہے ضبطِ نالہ سے دل اور بے قرار کرتا میں صبر، صبر پہ ہوتا جو اختیار
پرساں نہیں جہاں میں کوئی سوگوار کا
دکھلاؤں کس کو داغ دلِ داغدار کا

کچھ اس طرح بیان کئے انکے حالِ زار گویا زباں سے تیر چلا تھا جگر کے پار
رکھتا تھا منہ کے آنکھوں پہ رومال بار بار تاثیر کر رہی تھی حریفوں کو بے قرار
بولا ادا نوشتۂ تقدیر ہو گیا
طاعت کا طوق پاؤں کی زنجیر ہو گیا

اندھیر ہے جُدا جو کسی کا ہو نورِ عین آرام اس کو خاک ملے، خاک آئے چین
یوں اہلِ کان کو رجو روتے ہیں کرکے بین اس کو بھی بے شعور سمجھتے ہیں شور و شین
کھتا نہیں دلوں سے کوئی اعتبار یوں
کرتے نہیں ہیں مردِ ہنشوں پہ وار یوں

عنی نہیں کہ قوم مسلماں ہے انتخاب روشن ہیں اس کے مہر و وفا مثل آفتاب
جرات میں بے نظیر شجاعت میں لاجواب مریخ ان سے آنکھ ملائے نہیں یہ تاب
ثانی نہیں جہاں میں کوئی اس دلیر کا
ضَیغم کا ہمہمہ ہے تو انداز شیر کا

مردانِ دیں پہ جُبن کا کیوں احتمال ہو ہے وہ خلف جو اپنے سلف کی مثال ہو
آئے مقابلے کو اگر کچھ کمال ہو کوئی ہو اس میں گیو ہو، رستم ہو، زال ہو
بے انتقام، اُلٹ کے اگر آستین لیں
پنجے مروڑ کر ابھی تلوار چھین لیں

صفدر، جری، غیور، اولوالعزم، من چلے جھیلے ہوئے ہیں سیکڑوں ہیبت کے مرحلے
رستم کو مار لیں، دم بیجا، یہ حوصلے روندیں غضب میں شیر کو یہ پاؤں کے تلے
اک ضرب میں ہزار ہوں ٹکڑے پہاڑ کے
چاہیں تو پھینک دیں درِ خیبر اکھاڑ کے

حملہ کریں عدو پہ جو یہ کہہ کے یا علی | پڑ جائے ہر طرف صفِ ہیجا میں کھلبلی
اسرار کارزار کے سب ان پہ منجلی | میدان صاف ہو گیا تلوار جب چلی
بڑھتے ہیں سوئے فوجِ ستم جھوم جھوم کے
کرتے ہیں وار تیغ کے قبضے کو چوم کے

ہٹتے نہیں انھیں کے قدم کارزار سے | بچے انہیں کے کھیلتے ہیں ذوالفقار سے
ان میں کا ایک بھی نہیں دبتا ہزار سے | ہاں مٹ گئے ہیں اب ستمِ روزگار سے
پژمردہ دل ہیں غم سے جگر داغدار ہیں
اُجڑے ہوئے چمن کے یہ گل یادگار ہیں

افسوس ان کی قدر نہ کی روزگار نے | گھیرا ہے چار سمت سے پھولوں کو خار نے
دل چور کر دیا فلکِ کج مدار نے | مرنے کی ٹھان لی ہے غریب الدیار نے
عزت کے مستحق ہیں یہ ہر اعتبار سے
زینت ہے تاج کی گہرِ آبدار سے

اب کیا کہیں کہ کون ہیں یہ اور کیا ہیں یہ | ابرِ کرم ہیں آج بھی گو بے نوا ہیں یہ
قیصر پہ جان و مال سے اپنے فدا ہیں یہ | سرشارِ جام و بادۂ مہر و وفا ہیں یہ
ہم کہہ کے اپنا واقعہ شرمائے جاتے ہیں
یورپ میں اب بھی نقشِ قدم پائے جاتے ہیں

تھے ایک روز مالکِ دیہیم و تاج ہم | شاہانِ تاجدار سے لیتے تھے باج ہم
رکھتے نہ تھے کسی سے کوئی احتیاج ہم | ہے کل کی بات یہ جسے کہتے ہیں آج ہم
دنیا میں اب تو قوم ہماری ذلیل ہے
المختصر یہ ایک فسانہ طویل ہے

آئے ہیں آج پاس ترے لو لگا کے ہم | اے صدرِ بزمِ عدل! تغافل ہے یہ ستم
انصاف کر کے دور ہو سینے سے کوہِ غم | ہم سب وفا شعار ہیں، اللہ کی قسم
نا واقفوں کی خدمتِ عالی میں عرض ہے
مسلم پہ پیروئ اولوالامر فرض ہے

اے خفتگانِ خوابِ گراں! اب اُٹھو اُٹھو! اے مصلحانِ قوم پڑے کروٹیں نہ لو!
اے ہادیانِ امتِ مرحوم! ہاں بڑھو! اے واقفانِ راز! کرو کچھ جو ہو سکے

تازہ ہے بات، ابھی سحرِ غم کی شام ہے
کچھ دیر کی تو قوم کی ترکی تمام ہے

کوشش جو آپ آج بھی مل کر کریں ہم پہنچیں ابھی ابھی درِ مقصود پر قدم
کیوں آپ کے جہاں میں اب وقب تھے مگر کرتے تھے دل سے پیروی شافع امم

مومن تھے دیں فروش نہ تھے، پاکباز تھے
ثابت قدم تھے، عاشقِ شاہ حجاز تھے

اسلاف کی شجاعت و جرات دکھائیے تصویر کھینچکر وہی صورت دکھائیے
اب وقت آگیا ہے کہ ہمت دکھائیے ان منکروں کو حق کی صداقت دکھائیے

سچے بیاں میں خوف کسی کا فضول ہے
ہے صدق میں نجات، یہ قولِ رسول ہے

اچھی ہو بات اگر تو کسی سے گلہ نہ ہو راضی ہو تم سے قوم، حکومت خفا نہ ہو
وہ دل بھی کوئی دل ہے جو درد آشنا نہ ہو غارت ہو جس میں خُلقِ رسولِ خدا نہ ہو

مانے نہ تازہ بات مری، کوئی بات ہے
اچھے اگر عمل ہیں تو بے شک نجات ہے

رہتے تھے دور دورِ سلف کم ورود سے روشن تھے دل چراغِ ہدایت کے نور سے
کرتے تھے روز کسبِ ضیا، شمعِ طور سے دبتی نگاہ کیا، صنم پُر غرور سے

حاصل ہو پھر وہ بات، وہی پھر زمانہ ہو
یہ ضرب کارگر اگر تازیانہ ہو

تم کو خیالِ قوم کبھی کیا نہ آئے گا اک دن بہت یہ زورِ نقاہت ستائیگا
بڑھ جائے گا مرض تو دوا سے نہ جائیگا دُنیا ہے یہ، جو کام کرے گا وہ پائیگا

تفتیشِ ظلم و جور نہ ہو یا سزا نہ ہو
چاہے جو دل سے قوم ہماری تو کیا نہ ہو

لندن میں چند صاحب ہمت باہم ہیں آج | ان کو نہیں ہے عزت ذاتی کی احتیاج
کیا قوم کی، وطن کی تمہیں کچھ نہیں ہے لاج | اللہ کیسی رسم ہے کیسا ہے یہ رواج

جلسے ہوں شکوۂ ستم روزگار کے
یاروں پہ اعتبار ہے، کہہ دو پکار کے

ہوگی جو وفد و تاج سے اک روز گفتگو | آئینہ بن کے واقعہ آئیگا روبرو
ہے اس کے دم سے شیخ و برہمن کی آبرو | ہستیم ما بہ ہند و نظر ما بہ سوئے او

دے داد عدل جارج پنجم خدا کرے
احقر! اسی پہ چھوڑ دو جو فیصلہ کرے

جلیل قدوائی

اثر صاحب کی یاد

وہ شکلیں یاد سے جن کی جگر میں ہوک اٹھتی ہے
جلیل اس دہر میں پیدا نہ ہوگا اب جواب اُن کا!

اس مضمون کی اپنے مقطع سے ابتدا کرنے کی میرے پاس ایک معذرت ہے۔ ۱۹۵۱ء میں اپنے دوسرے مجموعہ کلام "نوائے سینہ تاب" کے مطبوعہ اجزاءِ کتاب کی اشاعت سے قبل بہ غرض اظہار رائے میں نے اثر صاحب کے پاس بھیجے تو انھوں نے اپنی رائے کے ساتھ حصۂ غزلیات سے متعلق چار صفحات پر مشتمل میرے بعض اشعار میں اپنی مجوزہ ترمیمات کی ایک فہرست بھی مجھے ارسال کی اور لکھا "ان پر غور کرلو، رد و قبول کا تمھیں اختیار ہے۔" دوسروں کے کلام میں خواہ بڑے سے بڑے شاعر کا ہو اگر ان کے نزدیک اس میں کوئی سقم یا کمزوری ہو وہ ترمیم پیش کرنے سے باز نہیں رہ سکتے تھے چاہے اس کی زد میں کسی کا سارا دیوان ہی

لہ اثر صاحب کی رائے میں نے "نوائے سینہ تاب" کے گرد پوش پر بابائے اردو، نیاز فتحپوری اور بعض دیگر ارباب علم کی آراء کے ساتھ شامل کی تھی مگر ترمیمات میں سے کچھ قبول کیں کچھ رد کر دیں اگرچہ مجموعہ میں اشعار اپنی اصلی حالت ہی میں رہے اس لئے کہ صفحات طبع ہو چکے تھے۔ اب اگلے ایڈیشن ہی میں اگر اس کی نوبت آئی وہ اشعار تبدیل شدہ صورت میں چھپ سکیں گے۔ قبول کی ہوئی ترمیمات میں سے ایک مثال ملاحظہ ہو۔ میری پہلی ہی غزل کا مطلع ہے ؎

روز و شب حسن رخ یار پہ حیراں ہونا ہے محبت میں یہی صاحب ایماں ہونا

اثر صاحب نے مصرعۂ اولیٰ میں ترمیم کی ؏

دیکھ کر حسن رخ یار کو حیراں ہونا

جو ترمیمات رد کر دی گئیں ان میں سے ایک مثال یہ ہے۔ میرا شعر تھا ؎

(باقی اگلے صفحہ پر)

کیوں نہ آجائے اور اس کام میں انھیں کتنا ہی زیادہ وقت عزیز کیوں نہ صرف کرنا پڑے۔ شاید اس روش کے وہی بانی تھے اور مختتم بھی۔ اپنے متعلقہ علم و فن سے کسی کو اتنا گہرا لگاؤ، اتنی شدید عقیدت اتنا والہانہ ربط تو ہو... ان کی اس خصوصیت کا مفصل ذکر تو آگے آئے گا مجھے کہنا یہ تھا کہ ان ترمیمات کے علاوہ میرے بعض اشعار پر موصوف نے صاد بھی فرمایا اور یہ مقطع انھیں اشعار میں سے ہے۔ میں نے تو ایک ... شعر کہا تھا مگر آج ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے صاد فرماکر آثر صاحب نے اسے اپنے لوحِ مزار کے لئے پسند کرلیا تھا۔

غالباً ۱۹۲۲ء میں اپنی طالب علمی کے ایام میں علی گڑھ سے کسی تعطیل میں اپنے سابق وطن اناؤ آیا تھا کہ رواں صاحب[1] کے ہاں یا اُن کے ذریعہ آثر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ وہاں ڈپٹی کلکٹر ہوکر آئے تھے اور اگرچہ خان بہادر نواب مرزا جعفر علی خاں آثر لکھنوی کہلاتے تھے خود وہ زندگی بھر اپنے دوستوں سے بہ اصرار لفظ "نواب" کو ترک کرنے کی فرمائش کرتے رہے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب جگر بھی رواں کے ہاں مقیم تھے اور کبھی کبھی موخرالذکر نیز آثر صاحب ہر دو کے استاد لسان الہند مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی بھی اناؤ کھینچ بلائے جاتے تھے۔ ایک دو بار اصغر صاحب بھی گونڈہ سے اناؤ آئے اگرچہ جہاں تک مجھے یاد ہے عزیز صاحب اور ان کا ساتھ کبھی نہیں ہوا۔ جگر صاحب عزیز صاحب کے کچھ زیادہ قائل نہ تھے مگر رواں کے سبب ان کا مناسب احترام کرتے تھے۔ جب آثر صاحب کی کوٹھی پر جو شہر سے باہر ایک باغ سے ملحق اور ایک پختہ تالاب کے کنارے واقع تھی جمع ہوتے تھے اور ایک دوسرے کا کلام سنتے سناتے تھے۔ سچ پوچھئے تو اس جماعت میں عمر اور شاعری دونوں کے اعتبار سے میں سب سے چھوٹا تھا اگرچہ میری بعض مطبوعہ تنقیدیں اور میری علی گڑھ کی طالب علمی میرے لئے وجہ اعزاز ہوگئی تھیں۔ رواں صاحب وکیل کی حیثیت سے ڈپٹی کلکٹر آثر سے اور نسبتاً کم عمر نیز کا ... ہونے کی سبب شاعر آثر اور جگر دونوں سے مرعوب تھے۔ اس لئے شعر سنانے کا فریضہ دراصل جگر اور آثر ہی ادا کرتے تھے بلکہ شعر گوئی اور شعر خوانی چونکہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ماسبق)

حسینانِ جہاں دیکھے ہیں میں نے   ہیں سب ناکام تخمین اس جوانی کی

انھوں نے مصرعہ ثانی تجویز کیا ؎

کہاں بانکی ادائیں اس جواں کی

ایک اور کرم یہ فرمایا کہ میری غزل سے

اس بت کی کشیدگی نہ پوچھو   آنکھوں کی رمیدگی نہ پوچھو

گلنار ہوئے ہیں جیب و دامن   اشکوں کی چکیدگی نہ پوچھو   وغیرہ

پر لکھا "ایک شعر ہوگیا۔ پسند ہو تو حاضر ہے سہ

ان آنکھوں کی جو کیفیت ہوئی ہے   اس نے کی رسیدگی نہ پوچھو

اس عطیہ آثر کو بہ خوشی بلکہ بہ صد افتخار قبول کیا گیا۔

[1] چودھری جگت موہن لال رواں آنجہانی۔

اثر صاحب کی کمزوری تھی اُن کی موجودگی میں اور خصوصاً ان کے دولت کدہ پر شعر سنانے کے معاملہ میں کسی اور کا اُن سے پیش پانا مشکل تھا حتیٰ کہ جگر بھی زیادہ تر سامع کا پارٹ ادا کرنے پر مجبور ہوتے تھے۔ واضح ہو کہ جگر صاحب کی حیثیت ابھی کم و بیش مقامی تھی اور معاشی اعتبار سے خصوصاً تو بہت لاچار دوسروں کے دست نگر تھے۔

اثر صاحب کی قیام گاہ پر اُن کی زبان سے شعر سننے سے بھی زیادہ دل پسند وہ ماحول ہوتا تھا جس میں شعر و شاعری کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں۔ یوں سمجھیے کہ ہم تالاب کے کنارے ایک کشادہ پختہ چبوترہ پر یا ان کے مغربی طرز پر آراستہ گول کمرے میں بیٹھے ہیں۔ یہ حصہ اگرچہ زنان خانہ سے الگ تھلگ ہے مگر خاصدان پر خاصدان جن کے اندر گیلوریاں لگی، بھیگے ہوئے سرخ کپڑے میں لپٹی، خوشبو میں بسی پانوں کے بیڑے بنے ہیں تھوڑے تھوڑے وقفہ سے آ رہے ہیں۔ برقی قوام کی شیشی ساتھ رکھی ہے۔ پان بنانے کا فرض اثر صاحب کے ایک مصاحب خاص کے سپرد ہے جو اسی ملحقہ برآمدے میں سبزے اور پھولوں کی کیاریوں اور گملوں کے درمیان پان کی ایک کھری چارپائی پر بیٹھے انجام دے رہے ہیں۔ نفیس ترین پان کہ منہ میں رکھتے ہی گھلنے لگیں، باریک کتری ہوئی چھالیا، لطیف کتھے اور چونے کی آمیزش، الائچی دانے وغیرہ۔ حقہ دور میں ہے اس کی تمباکو کی مہک کمرے میں پھیلی ہوئی ہے۔ ادھر ادھر احباب ہیں اور صدر نشین کی حیثیت سے اثر صاحب اپنی بیاض کھولے سنہری کمانیوں کا چشمہ لگائے اپنی قدرتی مسکراہٹ کے ساتھ دھیمی آواز اور تحت اللفظ انداز میں قدرے دانت بھینچ کر یا چبا چبا کر سامعین سے زیادہ گویا خود اپنے کو شعر سنا رہے ہیں اور سناتے چلے جا رہے ہیں۔ وہ داد کے طالب ضرور ہوتے تھے مگر یہ ضروری نہ تھا کہ داد نہ ملنے سے ان کی دل شکنی ہو۔ سب کے ساتھ بیٹھنا ہی ان کے لئے بڑی داد تھی۔

اثر صاحب باہر اعلیٰ درجے کے سوٹ پہنتے تھے اور گھر پر بھی کبھی کبھی پورے انگریزی لباس میں ملتے تھے مگر عموماً سفید براق ململ کے کرتے اور لٹھے کے پاجامے میں ہوتے تھے۔ شعر کہنا اور شعر سنانا ان کے خمیر میں تھا۔ کثرت سے کہتے تھے اور فرصت ہی کے اوقات میں نہیں، دوران مقدمہ، بر سر اجلاس، اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی کے ساتھ شعر بھی کہتے رہتے تھے۔ بارہا مقدمات کی مسلوں یا فریقین مقدمہ کے بیانات میں ان کے کہے ہوئے اشعار کے پرچے ملے یا خود سرکاری تحریروں کے صفحات پر ان کا کلام مندرج پایا گیا۔ جو بعد میں اہلکاران متعلقہ نے ان تک پہنچا دیا۔ کچہری جانے سے پہلے یا وہاں سے واپسی پر ہم میں سے کسی کے ہاں اپنا تازہ ترین کلام سنانے تشریف لے آتے۔ ایک بار میں بیماری کے باعث یونیورسٹی سے گھر آیا ہوا تھا۔ دیکھا کہ دوپہر کے وقت چلے آ رہے ہیں۔ میں نے کہا یہ تو کچہری کا وقت ہے۔ فرمایا "پٹواریوں کے معائنے کا دن تھا ان کے جمع ہونے تک دیر تھی سوچا جلیل کو رات کی کہی ہوئی غزل سنا آؤں"۔

انھیں دنوں ان کا پہلا مجموعہ کلام "اثرستان" شائع ہوا جو انھوں نے مجھے بغرض تبصرہ عنایت کیا۔ مجھے نہیں معلوم مجھ سے ان کی کیا توقعات تھیں۔ مگر میں نے رسالہ "الناظر" لکھنؤ میں اس پر سخت تنقید کی[1]۔ شاید یہ کہنا زیادہ صحیح

---

[1] یہ مضمون میرے مجموعہ "تنقیدیں اور خاکے" میں شامل ہے۔

ہو کر ان کی شاعری کی تحسین میں بھی لکھا مگر ان کے قدیم کلام یعنی میت، جنازہ، گورِ غریباں، ڈوبتی ہوئی نبضیں، پتھرائی آنکھیں وغیرہ جیسے خیالات کے بارے میں جن سے وہ اس وقت تک قطعاً آزاد نہ ہو سکے تھے انھیں سختی سے ٹوکا اور انھیں توجہ دلائی کہ ایسے اشعار مجموعے سے خارج کر دینا مناسب تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ میری اس جسارت پر وہ مجھ سے ناخوش نہیں ہوئے اگرچہ اپنی صفائی میں کئی ملاقاتوں میں برابر کچھ نہ کچھ کہا۔ مثلاً یہ کہ جو اشعار مجھے ناپسند ہیں ان کے کئی دوسرے احباب نے ان میں سے بعض کو بہت پسند کیا۔ یا یہ کہ شاعر انسان ہوتا ہے اور اسے اپنی زندگی کے جملہ تجربات رقم کرنے کی آزادی ہونی چاہیئے وغیرہ وغیرہ۔ مگر عرصے کے بعد جب انھوں نے اپنا کلیات "بہاراں" کے نام سے شائع کیا تو اس میں "اثرستان" کا انتخاب شامل کیا جس میں سے قابل اعتراض اشعار حذف کر دیئے۔

وہ تو ناخوش نہیں ہوئے اور نہ ہمارے تعلقات میں کسی قسم کا فرق آیا مگر میرے والد صاحب اور ایک قریبی عزیز مجھ پر برہم ہوئے اور میرے پیچھے پڑ گئے کہ میں نے چھوٹا ہو کر ایک بزرگ کی توہین کی ہے اس لئے ان سے معذرت طلب کروں۔ انھیں عزیز سے مجھے معلوم ہوا کہ اثر صاحب کی ابتدائی ملازمت کی تربیتی میعاد کے دوران میرے والد صاحب نے انھیں کام سکھایا تھا، اس کی تصدیق بعد میں والد صاحب اور اثر صاحب دونوں نے کی مگر مجھ پر اس دلیل کا کوئی اثر نہ ہوا اور میں نے معذرت نہیں چاہی۔ اثر صاحب نے عرصۂ دراز کے بعد مجھ سے اس کا بدلہ یوں لیا کہ میرے پہلے مجموعۂ کلام "نقش و نگار" پر ہندستانی اکیڈمی الہ آباد کے تماہی رسالے "ہندستانی" میں ایک مفصل مضمون تحریر فرمایا جس میں میرے کلام کی تحسین کے سوا کچھ نہ تھا اور اس میں ایسی ایسی نزاکتیں پیدا کیں، اشعار کے ایسے ایسے معنی نکالے کہ باید و شاید اس کی وجہ یہ بتائی کہ "ہم لوگوں میں دوست کے بیٹے کو دوست نہیں کہتے بلکہ مثل اولاد کے سمجھتے ہیں ... اور چھوٹوں پر بھری محفل میں نکتہ چینی کچھ عجیب سی بات ہوگی لہذا اس مضمون میں آپ جلیل کی قوت فکر و لطافت خیال کی تعریف ہی پائیں گے"[1]۔

تنقید کے معاملے میں اثر صاحب کا رویہ عموماً بے لاگ ہوتا تھا۔ انھیں قدما کے علاوہ میر اور غالب سے خاص طور پر فیض پہنچا تھا۔ اور اول الذکر سے تو غلو تھا۔ ان کے استاد حضرت عزیز خود ان ہر دو اساتذہ کے پرستار اور لکھنوی شاعری میں انقلاب پیدا کرنے والوں میں سے تھے۔ اثر صاحب کا انگریزی ادب عالیہ کا مطالعہ بھی وسیع تھا خصوصاً رابرٹ برنس اور کیٹس کی آتش نفسی کے بے حد قائل تھے۔

اسی لئے زبان، بیان، محاورہ اور روزمرہ کے علاوہ تخیل، محاکات، فلسفۂ حسن و عشق اور حقائق زندگی پر بھی ان کی نظر رہتی تھی۔ خود ان کی شاعری روایتی لکھنوی رنگ کی حدیں توڑ رہی تھی۔ وہ اپنی ذات سے وسیع النظر تھے، اور اپنے معاصر شعرا کے کلام میں جدت اور ترقی کی دل کھول کر داد دیتے تھے جب اصغر صاحب کا پہلا مجموعہ "نشاطِ روح" شائع ہوا تو

---

[1] ملاحظہ ہو "اثر کے تنقیدی مضامین"

انھوں نے ان کے کلام کی بڑی داد دی - اصغر صاحب کے شعر ؎

میں ہوں ازل سے گرمِ رہِ عرصۂ وجود
میرا ہی کچھ غبار ہے دنیا کہیں جسے

کی بابت لکھنؤ میں وصل بلگرامی مرحوم کے ہاں ایک محفل میں انھوں نے بڑے جوش کے ساتھ اصغر صاحب سے کہہ دیا کہ "آپ نے غالب کو اس کی اپنی ہی زمین میں شکست دی ہے" ساتھ ہی وصل کے رسالے "مرقع" میں "نشاط روح" پر ایک زبردست تحسینی مقالہ تحریر کیا - جس میں ان کی بلاغت کی خوب خوب داد دی اور ان کے اشعار کی تشریح میں قلم توڑ دیا - اس سے اصغر صاحب کے کلام کی خوبیوں کے علاوہ اثر صاحب کی اعلیٰ شعر فہمی بلکہ سخن سنجی کا ثبوت بھی بہم پہنچتا ہے - کہا جاتا ہے کہ داد کا یہ بھرپور انداز ان کے استاد کو پسند نہ آیا جن کے اشارے پر بعد میں "مرقع" ہی میں آثر صاحب نے اصغر صاحب کی شاعری کی دھجیاں بکھیر دیں -

اگر میں غلطی نہیں کرتا تو اردو میں اس بدعت کی ابتدا جسے نیاز صاحب نے بھی اپنایا آثر صاحب ہی نے کی تھی کہ تنقید کے سلسلے میں شعر کی اصلاح بھی تجویز کی جائے - بلکہ شاعر اپنا سارا اصل کلام دریا برد کرکے تنقید نگار کی طرف سے بہم پہنچایا ہوا اصلاح شدہ کلام قبول کرلے - اصغر صاحب کے کلام پر اپنے دوسرے مضمون میں آثر صاحب نے یہی انداز اختیار کیا تھا۔ اور ان کے بے شمار اشعار پر اصلاحیں تجویز کی تھیں - بہرحال داد ہو یا بے داد، از خود ہو یا کسی کے اشارے پر، یہ ماننا پڑتا ہے کہ شعر کے حسن و قبح کے تمام پہلوؤں پر ان کی انتہائی غائر نظر رہتی تھی اور ایسے ایسے انداز سے تنقید کرتے تھے، اتنے مختلف پہلوؤں سے شعر پرکھتے تھے، اور اس قدر تفصیل اور تشریح میں جاتے تھے کہ خود شاعر اپنے اشعار کے بارے میں اپنا ذہن ان پہلوؤں کی طرف منتقل نہ کر سکتا تھا۔

بہ حالات ان کے اناؤ کے دوران قیام کے ہیں اس زمانے میں بارہا وہ میں روآں اور جگر کانپور کے مشاعروں میں ان کے ساتھ شریک ہوئے اور ایک ہی طرح پر غزلیں کہیں اور پڑھیں وہ کانپور میونسپل کمیٹی کے اگزکٹو افسر رہ چکے تھے۔ اس کے بعد ان کا تبادلہ بہ حیثیت ڈپٹی کمشنر لکھیم پور کھیری (یو پی) کا ہو گیا، مجھ سے ان کے خلوص اور شاعرانہ مودت کا یہ ادنیٰ ثبوت ہے کہ اس زمانے میں میں نے انھیں علی گڑھ کے ایک مشاعرے میں شرکت کی دعوت بھجوائی اور خود بھی خط لکھا - اول تو کھیری علی گڑھ سے سینکڑوں میل دور، پھر جاڑے کا موسم، اور وہ صدر مقام سے بہت دور کسی دیہات میں دورے کے سلسلے میں پڑاؤ ڈالے پڑے تھے مگر میرا خط پا کر اور ہزار جتن کرکے علی گڑھ چلے ہی تو آئے - مشاعرے میں شریک ہوئے - میرے ہاں ٹھہرے اور کئی دن مختلف جگہوں پر شعر و شاعری کی نشستیں رہیں اور ان کی وہاں بڑی عزت و توقیر ہوئی، پھر جب وہ کشمیر میں وزیر ہو کر چلے گئے تھے تو وہاں مجھے بلایا مگر میں نہ جا سکا - سالہا سال بعد غالباً ۱۹۵۴ء میں کراچی میں منعقدہ ایک ہند و پاکستان مشاعرے میں جس کی صدارت نیاز صاحب نے لکھنؤ سے آکر کی تھی اور جس میں جوش اور فراق بھی ہندوستان سے آکر شریک ہوئے تھے -

اثر صاحب سے ملاقات ہوئی ۔ بے انتہا بدل گئے تھے ۔ موٹے کبھی نہ تھے ، اب اور دبلے ہو گئے تھے ، چہرہ ستا گیا تھا ۔ گالوں میں گڑھے پڑ گئے تھے مگر مسکراہٹ کی ادا وہی تھی ۔ چہرے پر حسن تھا نہ رعب ' عمر کا تقاضا تھا ۔ سوٹ کے بجائے شیروانی اور گاندھی کیپ میں انھیں میں نے پہلی بار دیکھا ۔ طبیعت مرجھا گئی ۔ مگر وہ جس گرم جوشی سے بغل گیر ہوئے ، اس نے پرانی یادیں تازہ کر دیں ۔ سابق سے کہیں زیادہ محبت اور خلوص سے ملے ۔ میرے اور بیوی بچوں نیز دیگر اہل خاندان کے حالات دریافت کرتے رہے ۔ دیر تک ساتھ رہا مگر مشاعرے سے باہر کوئی ملاقات نہ ہو سکی ۔ افسوس اس کے بعد انھیں دیکھنا نصیب نہ ہوا ۔ چند دن ہوئے کہ اچانک ان کی وفات کی خبر ملی ۔ اپنی دلگیری کا عالم بیان نہیں کر سکتا اور اس زمانہ کا میرا ایسا ہے بھی کون جسے بتاؤں ۔

جہاں تک اثر صاحب کی شاعری کا تعلق ہے ، جب میری اور ان کی ملاقات کی ابتدا ہوئی ، ان کی شعر گوئی پر خاصا عرصہ گزر چکا تھا اگرچہ انھوں نے کوئی غیر معمولی مقام حاصل نہیں کیا تھا ۔ اس کے بعد سے اب تک چالیس سال سے زاید کی مدت میں انھوں نے نہ جانے کتنا اور کیا کچھ کہا اور طبع کرانے پر کس نہ جانے کیا کیا اور کتنا کلام غیر مطبوعہ رہا ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے مسلسل مشقِ سخن سے اپنے استاد سے کہیں زیادہ نام پیدا کیا تھا ۔ اور موجودہ زمانے میں ان کا شمار غزل کے اساتذہ میں ہوتا تھا ۔ انگریزی سے اردو منظوم ترجمہ کرنے میں بھی انھوں نے بڑی مہارت حاصل کر لی تھی ۔ بنگلہ زبان سے واقف نہ تھے مگر نذر الاسلام کے اردو نثری ترجموں کو سامنے رکھ کر بعض پوئٹ کے منظوم ترجمے کیے تھے ۔

میرے پاس موصوف کے بہت سے خطوط تھے ان میں سے کچھ خطوط زمانہ گزر گیا صفدر مرزا پوری کو ان کے مجموعے کے لئے دے دیے تھے ۔ ان کی وفات کے بعد کہاں گئے ، کچھ نہیں معلوم ۔ پاکستان میں میرے نام آئے ہوئے ان کے بہت سے خطوط میں سے کچھ " ماہ نو " کے دفتر میں رہ گئے جب میں اس رسالے کا نگراں تھا چند جو دستبردِ زمانہ سے محفوظ رہ سکے ، اس مضمون کے آخر میں شامل کئے جاتے ہیں ۔ ان میں سے بعض سے میرے بیانات کی تائید ہو گی اور ان کے کلام و تحریرات کی کچھ تفصیلات معلوم ہو سکیں گی ۔ اس وقت میری زبان پر ان کے یہ چند اشعار بار بار آ رہے ہیں جنھیں اثر صاحب سے ابتدائے ملاقات کے بعد سے آج تک نہیں بھولا ہوں اور جنھیں انھیں کے نہیں ، اردو شاعری کے معجزات میں سمجھتا ہوں ؎

تیرے شہر کا نام جس نے لیا — میں سمجھا کہ خط کا جواب آ گیا

مسجدوں اور خانقاہوں کا تماشا دیکھ کر — میں پھرا دل کی طرف شکرِ خدا کرتا ہوا

سنتے ہیں حشر میں ہو گا ترا دیدار نصیب — ہائے کیا لطف ہو ، اس دن کی اگر رات کبھی ہو

میں تر زبان مذمتِ صہبا میں شیخ عصر — یہ تلخ تجربے انھیں آخر کہاں کے ہیں

تمھیں یہ دل [illegible] — مگر کسی کو تمھارا گماں نہیں ہوتا

وہ [illegible] میں ڈوبے ہوئے [illegible] — کہ جیسے جام میں صہبائے ناب ہوتی ہے

ایسے باکمال بزرگ کا دنیا سے اٹھ جانا اردو زبان و ادب کا زبردست سانحہ ہے ہر اہم شخصیت کی وفات پر شیوما یہ کہا جاتا

ہے کہ اس کا نعم البدل ملنا مشکل ہوگا۔ میرا خیال ہے اپنے گوناگوں اوصاف کے سبب آثر صاحب نے اردو غزل کی محفل میں جو جگہ خالی کی ہے اس کا پُر ہونا مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے۔ بعضوں نے کوئی شاگرد بغیر تیار کئے اس دنیا سے رخصت ہے توئی دوسرا شیوہ بیش بند ہوگی۔

(۱)

کشمیری محلہ۔ لکھنؤ

۱۳ر جولائی ۱۹۵۸ء

عزیزی جلیل قدوائی

تمہارا ایک خط مدت کے بعد ملا۔ معلوم ہوا کہ ایک دولت مل گئی۔ تمہارے خط میں ۲۰ر جون تاریخ پڑی ہوئی ہے مگر مجھے دو دن ادھر ملا۔ تصویر ڈھونڈھتا رہا۔ افسوس کوئی کاپی موجود نہیں۔ حال ہی میں اپنے بعض تنقیدی مضامین کا مجموعہ چھان بین کے نام سے شائع کیا ہے۔ ناشرین کو ہدایت کرتا ہوں کہ ایک کاپی تمہارے نام روانہ کردیں۔

رزم ردولوی کا ایک خط میرے پاس آیا تھا کہ کراچی میں ایک عظیم الشان مشاعرہ ہونے والا ہے اور یہ کام ان کے سپرد کیا گیا ہے کہ مجھے شرکت پر رضامند کریں۔ خط اس قدر مبہم اور عجیب تھا کہ میں نے معذوری کا اظہار کیا۔ تمہارا خط ملنے سے دل کلبلاتا ہے کہ اسی بہانے سے مرنے سے پیشتر تمہیں دیکھ لوں۔ اگر مفصل حالات دریافت کرکے لکھو اور یہ کہ پرمٹ وغیرہ کا کیا انتظام ہوگا۔ ہوائی جہاز میں PASSAGE بک کرانے کا کیا انتظام ہوگا۔ راستہ کون اختیار کرنا پڑے گا تو سفر کی نیت کروں۔ بچوں کو اور اپنی بیگم صاحبہ کو ہماری دعا۔

خیر طلب آثر

(۲)

کشمیری محلہ۔ لکھنؤ

۲۷ر جولائی ۵۸ء

پیارے جلیل قدوائی دعا

۲۰ر جولائی کا تحریر کردہ خط ملا۔ میری تصنیفات کی ایک طویل فہرست ہے۔ کتنی ہی طبع ہوچکی ہیں اور کتنی ہی باقی ہیں۔ لیکن افسوس کہ اکثر خود میرے پاس موجود نہیں۔ دو کتابیں بہاراں دیوان اور لالہ و گل، مجموعہ رباعیات و قطعات موجود تھیں۔ ان کی روانگی کا انتظام دانش محل کتاب گھر کی معرفت کیا ہے۔ امید ہے کہ جلد ہی وصول ہوں۔

میرا کوئی فوٹو بھی میرے پاس نہیں اور ۷۷ برس کی عمر میں تصویر کھنچواتے گھن آتی ہے۔

۷ر اگست کو دہلی اسٹیشن سے ایک مشاعرہ نشر ہوگا۔ میرا بھی ارادہ شرکت کا ہے۔ موقع ملے تو سننا۔ غالباً دس بجے شب سے براڈکاسٹ شروع ہو۔ اپنی بعض مطبوعات کے نام لکھتا ہوں۔ ممکن ہے کہ ان میں سے بعض لاہور میں مل جائیں۔

۱۔ رنگ بست (منظوم تراجم) اردو اکیڈمی لاہور۔

۲- مزامیر (انتخاب کلام میر) کتابی دنیا دہلی-
۳- ہلاک فریب (ڈرامہ)
۴- نغمۂ جاوید (گیتا کا منظوم ترجمہ) راج محل پبلشرز جموں کشمیر
۵- اثر کے تنقیدی مضامین - نظامی پریس بدایوں

دعاگو - اثر

(۳)

کشمیری محلہ - لکھنؤ
۲۵ر اگست ۱۹۶۸ء

پیارے جلیل قدوائی

تمھارا ۲۰ر اگست کا مرقومہ خط کل شام کو ملا ..... لکھنؤ والوں پر کچھ ایسا انحطاط چھایا ہوا ہے کہ حضرت صفی مرحوم کے حالات وہ لوگ بھی جو ان سے بخوبی واقف تھے مہیا کرنے میں بخل سے کام لیتے ہیں یا کاہلی برتتے ہیں۔ مجھے ان کی خدمت میں حاضری کے بہت کم مواقع ملے - چاہتا ہوں مضمون لکھنے کے لئے کافی مواد فراہم ہو جائے تو قلم اٹھاؤں -

تمھاری محبت اور اثر نوازی کا کہاں تک شکریہ ادا کروں ..... سیتاپور کے ایک نہایت شریف اور باوقار خاندان سے تعلق رکھتا ہے - خود بھی ہونہار معلوم ہوتا ہے - میرے ایما پر تم سے ملا تھا اور جس خلوص و محبت سے تم اس سے یہ معلوم ہونے پر پیش آئے کہ میں اس کی فلاح و بہبودی کا خواہش مند ہوں اس کے لئے نہ صرف وہ بلکہ میں بھی احسان مند ہوں -

غیر زبانوں کے تراجم کا ایک اور مجموعہ تیار ہے ..... اور نہ جانے کتنے تراجم شامل ہیں - مگر کون چھپوائے - نہ معلوم کتنے غیر مطبوعہ تنقیدی مضامین اکٹھا ہو گئے ہیں - کتنے جو مختلف رسائل میں چھپے تھے وہ ملتے نہیں اور نقلیں میرے پاس موجود نہیں - تیسرا دیوان مکمل ہے - کتنے ہی قصائد ہیں - سلام ہیں - نوحے ہیں - ایک مرثیہ بھی ہے - غزلوں کے علاوہ سو سوا سو نظمیں ہیں - لڑکیوں کو وصیت کر جاؤں گا کہ میرے مرنے کے بعد یہ سب تمھارے سپرد کر دیں - ممکن ہے کہ یونہی محفوظ ہو جائیں - کلام اس قابل نہیں مگر شاید تاریخی حیثیت سے کارآمد ہو -

دعاگو - اثر

(۴)

کشمیری محلہ - لکھنؤ
۷ر ستمبر ۱۹۶۸ء

عزیزی جلیل قدوائی

"نوائے سینہ تاب" کا ایک نسخہ ملا - حسب فرمائش ایک مختصر نوٹ لکھ دیا ہے - علاوہ بعض تجویزیں بمقتضائے محبت ہیں۔

ان پر غور کرلو - رد و قبول کا تمھیں اختیار ہے -

"ماہ نو" کا جشن استقلال نمبر بھی ملا - سرسری نظر ڈالی - ہر لحاظ سے خوب ہے -

اپنی بیگم اور بچوں کو میری دعا کہو -

خیر طلب - اثرؔ

(۵)

کشمیری محلہ - لکھنؤ

۸ر نومبر ۵۰ء

عزیزی جلیل قدوائی دعا

صفی پر ایک نظم اور چند غزلیں بھیج رہا ہوں تاکہ جب چاہو "ماہ نو" میں چھاپو -

جو رسالے رجسٹری کر کے بھیجے جاتے ہیں وہ مل جاتے ہیں - رجسٹری کے مصارف اگر ضوابط کی بنا پر محکمے کو برداشت نہ کرنا چاہیئے تو میرے ذمے رکھو - میں نے محکمۂ پوسٹ آفس کو شکایت کا خط لکھ دیا ہے ، دیکھیئے کیا نتیجہ ہوتا ہے -

کیپٹن طباطبائیؔ نے مکان بدل دیا ہے اور اب ان کا پتہ :-

۲۲۷ گاف روڈ ، راولپنڈی

ہے - باقی حالات بدستور ہیں -

دعاگو - اثرؔ

(۶)

کشمیری محلہ - لکھنؤ

۱۲ر جون ۵۱ء

عزیزی جلیل قدوائی

خط ملا - یاد آوری کا شکریہ -

ارے بھائی میں بہت بیمار اور موت کا منتظر رہتا ہوں - کلام اتنا جمع ہو گیا ہے کہ اس کا انتخاب کرنا اور کتابی صورت میں اشاعت کے لئے ترتیب دینا میری طاقت سے باہر ہے -

"نقش و نگار" کا ایک نسخہ میرے پاس تھا ضرور اور خیال ہوتا ہے کہ "ہندستانی" میں میرا تحریر کردہ تبصرہ بھی شائع ہوا تھا - ڈھونڈوں گا - اگر مل گیا تو تمھارے حکم کی تعمیل کروں گا - مگر اب "اثرؔ وہ پہلا اثر نہیں ہے"

بچوں کو دعا -

خیر طلب - اثرؔ

لہ اثرؔ صاحب کے داماد

(٧)

کشمیری محلہ - لکھنؤ

یکم جولائی ٦٠ء

پیارے جلیل قدوائی

تمہارا خط ملا - دل باغ باغ ہو گیا بھلا میں تم کو بھول سکتا ہوں - اگرچہ ٨٠ برس کے قریب عمر ہوئی اور قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں مگر ان دنوں کی صحبتیں آنکھوں میں پھرتی ہیں - جب تم علی گڑھ میں تھے اور مجھے بلایا تھا اور میں نہ معلوم کتنی مصیبت جھیل کے پہنچا تھا - حافظہ جواب دے چکا ہے مگر وہ باتیں اب تک یاد ہیں - اگر میری اولاد نرینہ ہوتی تو شاید تم سے اتنی ہی محبت کرتا جتنی تم سے ہے - میں نے نہ معلوم کتنا لکھا اور کیا کیا لکھا - غیر مطبوعہ مضامین تو ایک طرف رہے بعض مطبوعہ کتابوں کے نسخے بھی میرے پاس نہیں - تم نے اپنے جن مطبوعات کا ذکر کیا ہے یاد نہیں پڑتا کہ میری نظر سے گزرے ہوں -

دو اشخاص میرے وہ مضامین اکٹھا کر رہے ہیں جو اب تک مختلف رسالوں میں نکلے مگر کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئے ہیں - جو کچھ میرے پاس تھے وہ بھی لے گئے - پھر بھی ڈھونڈنے سے شاید کچھ مل جائیں - اگر کامیابی ہوئی تو بھیج دوں گا - انشاء اللہ

خدا تمھیں سلامت رکھے اور خوش رہو آباد رہو -

تمھارا شیدا - آثر

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

افادات اکبر

سالہ ۱۹۱۱ء میں جارج پنجم فرمانروائے سلطنت برطانیہ کا جشنِ تاج پوشی منایا گیا۔ برعظیم بھارت و پاکستان میں بھی شاندار تقریبات منعقد ہوئیں۔ اخبارات نے اپنے خاص نمبر نکالے۔ ہفتہ وار "زمیندار" نے بھی (جو ابھی روزنامہ نہیں ہوا تھا) ۲۴ جون ۱۹۱۱ء کو اپنا "کارونیشن نمبر" نکالا۔ اس نمبر میں دیگر ادبا و شعرا کی نگارشات کے علاوہ اکبر الٰہ آبادی کی ایک رباعی بھی شامل ہے۔ اور اس رباعی کے ساتھ (ظفر علی خاں کے نام) ایک طویل خط ہے جس میں دو فارسی کے اور ایک اردو کا شعر ہے۔ اکبر کی یہ رباعی ان کے کلیات حصہ دوم، صفحہ ۸۷ پر ہے۔ دوسرے اشعار اور یہ خط ان کے کسی مجموعے میں شامل نہیں۔ یہ خط اس رباعی کے پس منظر کے علاوہ اکبر کے ذہن و فکر کے بعض زاویوں پر بھی روشنی ڈالتا ہے اس لئے بہت اہم ہے۔ خط درج ذیل ہے :

"از الٰہ آباد۔ ۱۶ جون ۱۹۱۱ء

جناب من! آج چھٹا مسہل ہے۔ سخت ناتواں ہو گیا ہوں۔ شدید تکلیف اٹھائی ہے۔ دنیا سے دل بالکل سرد ہے۔ رزق مایحتاج مل رہا ہے۔ کسب معاش پر مجبور ہوتا تو کچھ کام کرنے کی شاید ضرورت ہوتی۔ اوضاع زمانہ خلافِ طبیعت ہیں۔ تنہائی نعمت ہے۔ ایسے یار جو مطمئن ہوں اور صرف سبحان اللہ والحمدللہ ولا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر ولاحول ولاقوۃ الاباللہ العلی العظیم کے ورد کو مقصودِ زندگانی اور حظ زندگانی سمجھیں، ناپید ہو گئے۔ آئیں کہاں سے۔ پیٹ کی فکر میں مصروف ہیں۔

ہمارے شاہ صاحب سے بھی اگلا رنگ خارج ہے
کبھی تھا اللہ ہی اللہ اب کالج ہی کالج ہے

دنیا کا یہی رنگ رہا ہے۔ خدا سب کو خوش رکھے۔ ہمارے ساتھ فلک نے وفا نہ کی۔ مغرب ہی کے ساتھ وفادار رہا۔

حضرت جارج خوش رہیں۔ لیکن ہمیں کیا۔ ہم تو دنیا سے آمادۂ سفر بیٹھے ہیں۔ خدا کو نہ دیکھا نہ اس کا قرب نصیب ہے۔ لیکن حمد کرنے سے جنت کی امید ہے۔ حضرت جارج کو بھی نہ دیکھا نہ قرب نصیب۔ لیکن قصیدہ خوانی پر جنت مشروط نہیں اور دنیاوی فائدے کی نا امید ہے نہ استحقاق۔ عیسائی ہو جائیں جب بھی داغ نیٹوِیت نہیں جاتا۔ پھر کیا ولی اُبھرے زمینداری نہیں۔ ملک و مال نہیں۔ لگاوٹ کی ضرورت کیا اور کریں بھی تو اس کا نوٹس کون لیتا ہے۔ یہی کافی ہے کہ ہم گورنمنٹ کے بدخواہ نہیں ہیں بلکہ خیر طلب ہیں۔ کوئی بھلا آدمی جس کے دماغ میں ذرا بھی عقل ہو۔ گورنمنٹ کا بدخواہ نہیں ہو سکتا۔

مشاعرے کی طرح ہوتی ہے تو لذخیز شاعروں کو طرح پر غزل کہنے کا ولولہ ہوتا ہے۔ قافیہ بندی ہو جائے، مطلب حاصل ہے۔ مقصود شاعری کی بحث سے کیا مطلب۔ یہی حال آج کل ہو رہا ہے۔ دو طرحیں موجود ہیں۔ یونیورسٹی[1] اور کارونیشن۔ غزلیں ہو رہی ہیں لیکن

چو بادِ صبا بر گلستاں وزد
چمیدن درختِ جواں را سزد

خصوصاً ایسی حالت میں کہ قوم مٹا رہی ہے۔

شکل مذہب را کہ می سازند تحسیں میکنم
معنی دیں را کہ می سوزند خلق آگاہ نیست

میں بستر پر پڑا ہوا بمشکل یہ نیاز نامہ لکھ رہا ہوں۔ آپ کا خط پڑھکر چاہا کہ اگر کچھ کہہ سکوں تو کہوں، لیکن میں کوئی مشین نہیں ہوں۔ بھوپال سے خط آیا کہ سرکار نے یاد فرمایا۔ آپ کے اشعار پڑھکر داد دی۔ ۲۵ جلدیں خرید بھی فرمائیں۔ فوراً آیئے۔ انعام کی امید ہے یہ ایک دوست کی مہربانی تھی۔ میری خواہش ہرگز نہ تھی۔

میں نے لکھا کہ اگر اس کام کو اور اس طمع میں آؤں تو جو کچھ میں نے لکھا ہے، وہ جھوٹھ کہلائے۔ صبر اور استقلال اور سلف ریسپکٹ اور اسی قسم کے اخلاقی اشعار کا کیا اثر ہوگا

---

[1] اس زمانہ میں مسلم یونیورسٹی کے قیام کا مسئلہ مسلمانانِ ہند کے پیش نظر تھا اور اس سلسلے میں چندے کی فراہمی کے علاوہ اس کی ہیئت و تشکیل مسلمان اکابر کا موضوع بحث تھی۔

میں بھی ایک لٹریری خونچے والا سمجھا جاؤں گا[ط] میں نہیں کہتا کہ درحقیقت میں کوئی بڑا فلاسفر یا ولی ہوں، استغفر اللہ، سخت گنہگار ہوں۔ اصل یہ ہے کہ بدن میں خون نہیں ہے۔ نشاط طبع نہیں ہے۔ سوائے اس کے میرے باپ ایک صوفی فلاسفر تھے۔ سقراط منش تھے۔ کچھ وہ اثر بھی ہے۔

ہاں شاعرانہ انوکھی ترکیب ذہن میں آئے تو کہیں بند نہیں ہوں، اگر آپ کو پسند آئے تو یہ رباعی حاضر ہے:

مفقود ہے گو کہ آج "یارونیشن" "قوم"
صد شکر ہوا ظہور "کارونیشن" "تاجپوشی"
مانگو خالق سے حضرت جارج کی خیر
تم بھی ہو جاؤ گے "لوٹارونیشن" "فردا"

(اکبر)

اس مکتوب اور اشعار کے علاوہ اکبر الہ آبادی کے چند اور اشعار بھی بطور تبرک کے پیش کئے جاتے ہیں۔ یہ اشعار بھی ان کے کسی مجموعۂ کلام میں راقم کی نظر سے نہیں گزرے۔ یہ اشعار اس زمانے کے ہیں جب پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء، ۱۹۱۸ء) ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ طرابلس کی جنگ (۱۹۱۱ء) کے بعد یورش بلقان (۱۹۱۲ء) نے عثمانی ترکوں میں ہیجان اور ہندوستانی مسلمانوں میں ایک کہرام برپا کر دیا تھا۔ دول یورپ اس جنگ و جدل میں گہری دلچسپی لے رہی تھیں۔ ریاست ہائے بلقان کی افواج متحدہ کی یورش اور نہ (ایڈریانوپل) پر قبضے سے یورپ کی مسیحی سلطنتیں جوش مسرت سے بیتاب ہو گئیں۔ مسٹر ایسکوئتھ (وزیر اعظم برطانیہ) نے شاہ یونان کو

ط حسن اتفاق دیکھئے۔ اسی قسم کا ایک واقعہ اقبال کو بھی پیش آیا۔ "یوم اقبال" کے موقع پر نظام حیدرآباد (دکن) کے توشہ خانے سے اقبال کے لئے ایک ہزار روپے کا چیک بطور "تواضع" بھیجا گیا تو انہوں نے یہ چیک واپس کر دیا اور ذیل کا قطعہ سر اکبر حیدری (وزیر اعظم حیدر آباد) کے نام لکھا:

تھا یہ اللہ کا فرماں کہ شکوہ پرویز دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات
مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاہی کر حسن تدبیر سے دے آنی و فانی کو ثبات
میں تو اس بار امانت کو اٹھاتا سر دوش کام درویش میں ہر تلخ ہے مانند نبات
غیرت فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات

(ارمغان حجاز)

مبارک باد کا پیغام بھیجا اور اس جنگ کو صلیب و ہلال کی آویزش قرار دیتے ہوئے قسطنطنیہ کی فتح کا مژدہ فرداً سنایا لیکن ترکانِ احرار کے مجاہدانہ جوابی حملے نے صلیبیوں کے پاؤں اکھاڑ دیئے اور ریاست ہائے بلقان کی فوجیں نہایت سراسیمگی کے ساتھ ادرنہ خالی کر کے بھاگیں۔ اس کے بعد دولِ یورپ نے اپنے روایتی انداز میں صلح کا کھڑاگ کھڑا کیا، اور فاتح ترکوں کو پیش قدمی روک کر صلح پر مجبور کیا جانے لگا۔

اس زمانے کی عثمانی سیاست کے سلسلے میں یہ امر بھی پیش نظر رہے کہ عثمانی خلیفہ سلطان عبدالحمید ثانی بتیس سال تک حکومت کرنے کے بعد ۲۷ اپریل ۱۹۰۹ء کو ترکانِ احرار کے ہاتھوں معزول ہوئے تھے اور ان کے بعد سلطان محمد خامس کا عہد حکومت تھا۔ جس میں اقتدار ترکانِ احرار کے قبضے میں تھا اور بطلِ حریت انور بے (بعد میں انور پاشا) وزیر حرب تھے۔

اس مختصر پس منظر کے ساتھ اکبر الہ آبادی کے مندرجہ ذیل اشعار (بحوالہ روزنامہ "زمیندار" ۲ر فروری ۱۹۱۳ء) پیش کئے جاتے ہیں:

کمیٹی میں نہایت سچ کہا کل شیخ چھیدی نے
کہ ٹرکی کو خرابی میں پھنسایا گھر کے بھیدی نے
جناب حضرت عبدالحمید اک مرد عاقل تھے
کب اُن کے عہد میں اغیار یوں صحبت میں داخل تھے
وہی تلوار ہے لیکن کہاں وہ رعب باقی ہے
وہی ہے جام و مے لیکن کہاں بانکا وہ ساقی ہے

اگرچہ سخت ہے دھمکی شدید ہیں حربے
نہیں ہیں صلح پہ راضی جنابِ انور بے
اگرچہ شیر پہ برچھے ہیں ہر طرف سے تنے
مگر وہ خوش نہیں اس سے کہ لیمپ ڈاگ بنے

سازش میں بتوں کی ہے تو پھر لڑکے کون
اللہ کی فوج ہے تو پھر روکے کون!

ہے یہ رفتارِ جہاں کون سی حالت کی طرف

بس جواب اس کا یہی ہے کہ قیامت کی طرف

یہ دور اتحادِ عالمِ اسلامی کے جذبات سے سرشار تھا۔ اکبر بھی بین الاقوامی واقعات سے (خصوصاً جن کا تعلق مسلمانوں سے تھا) متاثر ہو کر کبھی کبھی اپنے احساسات کو شعر کا جامہ پہنا دیتے تھے۔ وہ طبعاً انتہا پسند یا انقلاب پسند نہیں تھے۔ تاہم اُن کا دل ملی سوز و درد سے معمور تھا۔ پہلی جنگِ عظیم اگست ۱۹۱۴ء میں (ولی عہد آسٹریا کے قتل پر) آسٹریا اور سردیہ کے مابین شروع ہوئی۔ اکبر کی ایک نظم بعنوان "خونِ شہیداں" ہفتہ وار "مساوات" الہ آباد میں شائع ہوئی:

"مبارک ہو کہ اب خونِ شہیداں رنگ لایا ہے"

جس وقت یہ نظم چھپی، اس وقت تک برطانیہ بھی جنگ میں شریک ہو چکا تھا۔ حکومت نے اس نظم کو خلافِ قانون قرار دے کر "مساوات" کو سخت تنبیہ کی۔ اکبر سے بھی بازپرس ہوئی۔ اس کے بعد وہ محتاط ہو گئے تاہم زبان پر کوئی طنزیہ شعر اس قسم کا آ ہی جاتا تھا۔ جو سینہ بہ سینہ دور تک پھیل جاتا تھا۔

پریس بیورو کی خبروں سے نتیجہ یہ نکلتا ہے

فتح سرکار کی ہوتی ہے قبضہ ان کا ہوتا ہے

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی

غالب کا فلسفۂ اُمید و یاس

غالب کے یہاں ہم کو دو بنیادی عناصر نظر آتے ہیں اور یہی دونوں عناصر ان کی شاعری کے فکری تانے بانے ہیں غالب ایک طرف بہت پرامید نظر آتے ہیں اور زندگی کی وسعتوں کو ناکافی سمجھتے ہیں دوسری طرف انسانی زندگی میں جو مجبوریاں اور مایوسیاں ہیں ان سے متاثر نظر آتے ہیں اور یاس اور امید کے دونوں پہلو شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کے کلام میں نمایاں ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔ ان کے کلام میں کشش اور حسن کا راز یہی ہے کہ انہوں نے انسانی زندگی کے ان پہلوؤں کا بڑا گہرائی سے مشاہدہ کیا ہے جن کا تعلق یاس و امید سے ہے۔ غالب خوب سمجھتے تھے کہ انسان کی زندگی کے دو پہلو ایسے ہیں جنہیں انسان کبھی بھی نظر انداز نہیں کر سکتا جو اس کی زندگی میں غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ ایک پہلو وہ ہے جس میں وہ خوش ہوتا ہے یعنی خوشی کا پہلو امیدیں قائم کرتا ہے اور دنیا کو ایک وسیع نظر سے دیکھتا ہے، اس کے دل میں امنگیں اور حوصلے پیدا ہوتے ہیں اور بلندیوں کے لئے اس کا دل بیقرار ہو جاتا ہے۔ امید کا یہ پہلو ایسا ہے کہ انسان اس کے سہارے بہت کچھ کرتا ہے۔ غالب اس پہلو کی بڑی ہی پرکیف تاویلیں کرتے ہیں! ور امید کی ایسی دنیا آباد کرتے ہیں جس میں انسان اپنے حوصلوں اور آرزوؤں کا نشان پاتا ہے اور اس سے تسکین حاصل کرتا ہے اور کلام غالب پڑھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ اسی کے دل کی آرزوؤں اور امیدوں کو نچوڑ کر پیش کر دیا گیا ہے۔ اس نظر سے اگر ہم کلام غالب کو دیکھیں تو ہمیں محسوس ہوگا کہ انہوں نے انسانی امیدوں کی کچھ ایسی تصویر کشی کی ہے اور اس کی دل کی دنیا کو کچھ اس طرح سمیٹ کر پیش کیا ہے کہ اس کی مثال دوسرے شعراء کے یہاں ملنی ناممکن ہے فرماتے ہیں۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
نا امیدی اس کی دیکھا چاہئے!

غالب نے اس شعر میں اپنے فلسفہ امید کو بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے اور انسان کے اندر عزم کی کیفیت کو بڑے عمدہ انداز سے سمجھایا ہے۔

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

اس شعر میں غالب نے اسی فلسفۂ امید سے کام لیا ہے اور انسانی کیفیت امید کی اچھی تصویر کشی کی ہے۔

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام!
دل کو خوش کرنے کی فرصت ہی سہی

اس شعر میں وہ باوجود اس کے کہ زندگی کے مصائب سے باخبر ہیں لیکن اپنی امید کے لئے دل کی خوشی کا سہارا لیتے ہیں اسی کیفیت کو اصغر گونڈوی نے بھی اچھی طرح پیش کیا ہے وہ کہتے ہیں۔

یہ ذوقِ دید یہ دیدار جلوہ خورشید
بلا سے قطرۂ شبنم کی زندگی کم ہے

وہ نا امیدیوں کے طوفان میں بھی امید کی کرن تلاش کر لیتے ہیں اور اپنی ناکامی میں بھی ایک لذت محسوس کرتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

بس ہجومِ نا امیدی خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذت ہماری سعیٔ بے حاصل میں ہے

اگر ان کا ذکر برائی سے ہوتا ہے جب بھی وہ اس میں بھلائی کا پہلو نکال لیتے ہیں اور کہتے ہیں۔

گرچہ ہے کس کس برائی سے و لے با ایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

غالب ہجومِ نا امیدی میں بھی کچھ ایسی باتیں تلاش کر لیتے ہیں جن سے دل بہلا رہے انہیں امید کا دامن کہیں نہ کہیں سے مل ہی جاتا ہے کہتے ہیں۔

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

گویا کہ غالب یہ کہہ کر کہ غم اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے اس لئے اس سے گھبرانا ہی کیا۔ ایک دوسری جگہ کہتے ہیں۔

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

دیکھیے یہاں غالب کس طرح سے درد و غم کو دوا میں تبدیل کر کے امید کا رشتہ قائم رکھتے ہیں اور اس حالت میں جہاں لوگ یاس میں ڈوب جاتے ہیں وہاں بھی ان کے ہاتھ میں آس کا دامن موجود رہتا ہے ایک دوسری جگہ امید کو ایک دوسری طرح سے حاصل کرتے ہیں اور غم سے پیچھا چھڑاتے ہیں۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

دیکھیے یہاں کس طرح سے ہجوم غم میں امید کا رشتہ منقطع نہیں کرتے اور غم کی بہترین تعلیل کرتے ہیں۔ اگر ان کے یہاں کوئی زبردست مصیبت آجاتے یا ان کا سب کچھ لٹ جائے تو وہ غم کی بجائے امید کے پہلو تلاش کر لیتے ہیں اور کہتے ہیں۔

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا!
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

غالب اگر شبِ فراق میں روتے ہیں تو وہ اس کی بھی تاویلیں کرتے ہیں اور امید کے پہلو تلاش کر لیتے ہیں اور آنسوؤں سے پُر آنکھوں کو امید کی شمع سمجھ کر اس سے کسب فیض کرتے ہیں۔

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

٭

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

اس شعر کی تشریح حالی نے بڑی اچھی کی ہے غالب کو دل سے یقین بھی ہے کہ شاید بجلی انہیں کے آشیاں پر گری ہے لیکن امید کا یہ عالم ہے کہ یہ سوچ لیتے ہیں کہ وہ آشیاں میرا ہی کیوں ہو جس پر بجلی گری ہو کسی اور کا بھی ہو سکتا ہے۔

دونوں جہاں دیکھے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آن پڑی یہ شرم کہ اب تکرار کیا کریں

غالب بار بار دل کو بہلانے والی کیفیت پیدا کرتے ہیں اور امید کے رشتہ کو منقطع نہیں ہونے دیتے۔ کہتے ہیں۔

عشرت صحبت خوباں ہے غنیمت سمجھو
نہ ہوئی غالب اگر عمر طبیعی نہ سہی

یہاں غالب زندگی کی بعض لذتوں سے دل بہلا کر عمرِ طبعی کی محرومی کو بھی گوارا کر لیتے ہیں۔ جنت میں بھی غالب کو کچھ نظر آئے نہ آئے مگر اُمید ضرور نظر آتی ہے وہ کہتے ہیں۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن!
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

ایک دوسری جگہ کہتے ہیں۔

کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی امید نہیں!

اس شعر میں غالب غیر معمولی طور پر مایوسی کا اظہار کرتے ہیں۔ ایک دوسرا شعر ملاحظہ ہو۔

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالب   ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا!

مذکورہ اشعار میں غالب کی مایوسی پوری طرح نمایاں ہے وہ انسان کی ایک ایسی کیفیت کی ترجمانی کرتے ہیں جس میں بڑا درد ہے اور کچھ ایسی کیفیتیں شامل ہیں جو انسان کے دل میں گھر کر جاتی ہیں چند اور اشعار ملاحظہ ہوں۔ وہ کہتے ہیں

فرصتِ کاروبارِ شوق کسے
ذوقِ نظارۂ جمال کہاں!

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

ان اشعار میں بھی غالب نے اسی فلسفۂ یاس سے کام لیا ہے۔ ایک شعر ملاحظہ ہو۔

سب بے دلی ہاتے تماشہ یہ کہ عبرت ہے نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دین

اس شعر میں غالب نے کتنی گہری مایوسی کا اظہار کیا ہے۔ جس کی مثال شاید اردو شاعری میں نہ مل سکے۔

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

یہاں وہ موت جیسی تاریکی کو لذت سے تعبیر کرتے ہیں

اب غالب کی شاعری کا دوسرا عنصر دیکھئے یعنی یاس جس طرح وہ انسان کی امیدوں کو پوری طرح سامنے لے آئے ہیں اسی طرح وہ انسان کی مایوسیوں کو اپنے کلام میں پوری طرح سمیٹ لیتے ہیں وہ کہتے ہیں۔

کوئی امید بر نہیں آتی ! کوئی صورت نظر نہیں آتی

ابن مریم ہوا کرے کوئی !
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

اس قسم کے اشعار غالب کے یہاں بہت ملتے ہیں۔ جوان کی یاس کو ظاہر کرتے ہیں۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

غالب اکثر مایوس ہو جاتے ہیں اور مایوسی کے عالم میں وہ انسانی جذبات کی بہترین ترجمانی کر جاتے ہیں۔ کہتے ہیں۔

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا !

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

یہ اور اس قسم کے کتنے ہی اشعار ہیں غالب کے یہاں جن میں حسرت و مایوسی کی ایک ایسی کیفیت ہے جو کسی دوسرے شاعر کے یہاں ہمیں نہیں ملتی۔ وہ کہتے ہیں۔

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہل جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

قید ہستی سے رہائی معلوم
اشک کو بے سر و پا باندھتے ہیں

جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام
دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

مذکورہ اشعار میں غالب انسان کی مایوسی کو مختلف انداز سے پیش کرتے ہیں اور زندگی کی ترجمانی کا عظیم کام انجام دیتے ہیں ایک شعر اور ملاحظہ ہو۔

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یارب کئی دیئے ہوتے

آہی جاتا وہ راہ پر غالب
کوئی دن اور بھی جیئے ہوتے

مقدور ہو تو خاک سے پوچھو کہ اے لئیم
تو نے وہ گنجہائے گراں مایہ کیا کیے

رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

مذکورہ اشعار میں غالب انسانی مایوسی کی بہترین ترجمانی کرتے ہیں اور کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کے دل میں بات اُتر جائے اور یہ درحقیقت ایسی انسانی آرزوئیں ہیں اور ایسی ناکامیاں ہیں جو سب کو معلوم ہیں لیکن جب غالب ان حقیقتوں کو آشکارا کرتے ہیں تو قارئین کے دل جیت لیتے ہیں۔

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

دیکھئے اس شعر میں غالب نے انسان کی بے ثباتی کو کتنے یاس انگیز طور پر پیش کیا ہے۔
یہ ہے غالب کا مختصر طور پر فلسفۂ امید و یاس اگر اس نقطۂ نظر سے کلام غالب پر ہم غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ مسرت اور غم کے پہلوؤں کو غالب سے زیادہ کسی شاعر نے حکیمانہ طور پر پیش نہیں کیا ہے یہی وہ ان کی خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے ان کا کلام بہت جاندار ہو گیا ہے اس لئے کہ وہ جہاں ایک طرف ذہن و فکر کی دولت سے کام لیتے ہیں وہیں وہ انسانی زندگی کا گہرا مطالعہ کر کے وہ پہلو اس میں سے اخذ کر لیتے ہیں جو انسان کو اپنی زندگی میں بہت اہم معلوم ہوتے ہیں اور جن سے اس کو ہمہ وقت سابقہ پیش آتا رہتا ہے چونکہ غالب نے امید و یاس جیسے اہم پہلوؤں کو اپنی شاعری میں سمویا ہے اس لئے ان کی شاعری اس لائق ہو سکی کہ وہ انسانی جذبات کی خوشی و مسرت دونوں حالتوں میں ترجمانی کر سکے اور اسی وجہ سے غالب کا کلام انسانی مسرت و یاس سے پر ہے اور زندگی کے مختلف مواقع پر غالب کے اشعار کچھ اس طرح پیش کئے جا سکتے ہیں کہ سننے والا یہ سمجھے کہ شاید یہ اشعار اسی موقع کے لئے لکھے گئے تھے۔
بہر حال غالب کے فلسفۂ امید و یاس پر جتنا بھی غور کیجئے گا اتنے ہی پہلو بلندی کے نکلتے آئیں گے اور اس طرح وہ ہمیں ایک عظیم ماہر نفسیات اور فن کار کے لباس میں نظر آئیں گے۔

کامیابی

کے لئے ضروری ہے کہ آپ
جو الفاظ استعمال کریں اُن کے معانی سے آپ پوری طرح واقف ہوں

اس سلسلے میں

اسٹوڈنٹس اسٹینڈرڈ انگریزی اردو ڈکشنری

آپ کی بہترین معاون ہوسکتی ہے

●

آپ گھر میں ہوں، دفتر میں یا سفر میں ـــــ
ہر جگہ یہ ڈکشنری آپ کی بہترین رفیق ہوگی

●

طلبہ، اساتذہ، وکلا، اطبا، مترجمین اور سرکاری کارکنوں
کے لئے "اسٹوڈنٹس اسٹینڈرڈ انگریزی اردو ڈکشنری"
ایک بہترین تحفہ ہے

●

خوبصورت طباعت	اعلیٰ درجے کا بائیبل پیپر
ڈیڑھ ہزار صفحات	مضبوط جلد

قیمت صرف اکیس۲۱ روپے

انجمن ترقی اردو بابائے اردو روڈ۔ کراچی نمبر۱

کوثر چاند پوری

جہانِ غالب

قومی زبان ماہ فروری سنہ ۶۶ء میں جہانِ غالب پر سید قدرت نقوی صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کو انتقادی کہنا اس لئے مناسب نہیں کہ تنقید کے لئے جس لب و لہجہ، توازن، سنجیدگی اور ضبط و وقار کی ضرورت ہے وہ اس میں سراسر مفقود ہے، اس کی جگہ ایک قسم کی جھنجلاہٹ اور کوئی ایسی بے نام سی چیز نمایاں ہے جس کو مضمون نگار کی زبان میں کسی مخصوص جذبے ہی سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ ادب میں جذبے کی شمولیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن مخصوص جذبات کی جستجو ادب ناشناسی کی دلیل ہے۔ ادب انسانیت اور محبت کا گہوارہ ہے۔ تخلیقی ذہن میں انسانیت کو طبقات میں بانٹنے کا تصور آ ہی نہیں سکتا۔ اس میں خلوص، دیانت اور انصاف کا احساس ہی کارفرما رہنا چاہیے۔ قدرت صاحب نے وہ اسلوب تحریر استعمال کیا ہے جسے تنقیص کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ تنقید میں بے راہ روی عام ہو گئی ہے اور تنقیصیت کا رجحان واضح طور پر ابھر آیا ہے حالانکہ کسی ادبی شہ پارے کو اس وقت تک پرکھا نہیں جا سکتا جب تک محاسن و معائب کا تجزیہ نہ کیا جائے۔ تخلیق کے ساتھ انصاف وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کو قدرت نے سنجیدہ اندازِ فکر عطا کیا ہو۔ اور جو دوستی اور دشمنی کی حس کو مرکزِ اعتدال پر قائم رکھنے کا شعور رکھتے ہوں۔ مضمون نگار جہانِ غالب پر اظہارِ خیال فرما رہے ہیں مگر ان کی پوری توجہ میری ذات اور دوسرے ادبی مشاغل پر مرکوز ہے۔ کہیں وہ مجھے مشہور افسانہ نگار کہتے ہیں اور کہیں معمولی افسانہ نگار، افسانہ ادب کی نہایت اہم صنف ہے لیکن انہیں افسانہ سے اتنا عناد ہے کہ وہ کسی افسانہ نگار کو تاریخ، تنقید، اور تحقیق کا اہل خیال نہیں کرتے، اگر مصنف شاعر بھی ہوتا تو ضرور وہ کہتے کہ شاعر کو تاریخی اور تحقیقی مباحث میں حصہ نہ لینا چاہئے۔ مضمون نگار اس حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوں گے کہ موجودہ دور میں شاعر اور افسانہ نگار دونوں تحقیقی، تاریخی اور انتقادی صلاحیتوں کا ثبوت دے رہے ہیں۔ قدرت صاحب سے یہ سوال بھی کیا جا سکتا ہے کہ انہیں کسی افسانہ نگار کا درجہ متعین کرنے کا حق کس نے دے دیا جبکہ وہ کسی ادبی صنف کے ساتھ انصاف ہی نہیں کر سکتے۔

جہانِ غالب لکھ کر میں نے اربابِ علم کو دعوتِ فکر دی۔ مقصد یہ تھا کہ غالب پرستی کے اس دور میں جب تاریخی حقائق پر بھی مشکل ہی سے توجہ کی جا سکتی ہے، افراط و تفریط کے اس رجحان کو معتدل کرنے کا تصور پیش کیا جائے۔ میرے مخاطب وہ حضرات نہیں تھے جو غالب کو پیغمبری کا درجہ دیتے ہیں۔ میں غالب کی عظمت، ان کے کلام اور فکر و خیال کی بلندی کا ہر جگہ اعتراف کرتا ہوں، اس کے باوجود میرے بیانات کو مخالفانہ اور منفی کہا جاتا ہے۔ کسی شاعر یا ادیب میں شعر و ادب کی خصوصیات ہی تلاش کی جا سکتی ہیں۔ اس میں پیغمبرانہ اوصاف کی جستجو کسی طرح مناسب نہیں۔ شاعر اور ادیب کا انسان ہونا ہی بہت بڑی بات ہے۔ وہ انسانی سطح پر رہ کر ہی تخلیق کے فرائض انجام دے سکتا ہے، اس لئے کہ وہ انسانی سماج ہی کا ایک فرد ہوتا ہے۔ معزز مضمون نگار کی علمی اور تصنیفی حیثیت کا مجھے بالکل علم نہیں۔ میں نہیں جانتا کہ وہ مشہور تنقید نگار ہیں یا معمولی، اگر یہ مضمون قومی زبان میں شائع نہ ہوا ہوتا تو یہ سطور لکھنا بھی ضروری خیال نہ کرتا۔ قومی زبان ایک مشہور اور معیاری رسالہ ہے اس بنا پر جو مضامین اس کے صفحات پر جگہ پاتے ہیں ان کو اہمیت دینی ہی چاہئے۔ مضمون نگار نے اس مختصر سے مضمون میں حقائق کو بڑی بڑی طرح مسخ کرنے کی ناکام سعی کی ہے۔ اور اعتراض کے لئے پوری کوشش سے گنجائش پیدا کی ہے ان کا ارشاد ہے کہ میں نے غالبیات کا مطالعہ نہیں کیا، لیکن وہ جس کتاب پر تنقید فرما رہے ہیں، ان کی تحریر سے ظاہر ہے کہ انہوں نے تین سو (۳۰۰) صفحات کی اس کتاب کو غور سے پڑھنے کی زحمت نہیں کی ورنہ بہت سے اعتراضات کا جواب کتاب ہی سے مل جاتا۔ اگر کتاب کو انہوں نے پڑھ کر یہ مضمون لکھا ہے تو کہنا پڑے گا کہ ان کا نقطۂ نظر نہ صرف مخالفانہ بلکہ تخریبی ہے اور وہ تنقید برائے تخریب کے قائل ہیں معلوم نہیں وہ کون سی طاقت ہے جو انہیں انصاف کے راستے پر گامزن ہونے سے روک رہی ہے اور وہ اپنی پوری طاقت خامیوں کی تلاش میں صرف کر رہے ہیں وہ اغلاطِ کتابت یا پروف ریڈر کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر مصنف کو تاریخ سے نابلد قرار دے رہے ہیں اسی کے ساتھ دوسرے مصنفین پر بھی خفگی و ناراضی کی آگ برسا رہے ہیں۔ جہانِ غالب کے پیش لفظ کی چند سطور ہی نقل کر کے انہوں نے ایک نتیجہ نکال لیا ہے انصاف اور دیانت کا تقاضا تھا کہ پیش لفظ کے باقی حصے پر بھی توجہ فرمائی جاتی تاکہ خیالات کا ربط اور تسلسل برقرار رہتا اور پڑھنے والوں کو مصنف کے عزائم کا علم ہو جاتا۔

"افراط و تفریط اور بغض و محبت کا یہ رجحان صحیح نہیں ہے اور تنقیدی ذمہ داریاں اس صورت سے پوری نہیں ہوتیں۔ معتدل راستہ یہ ہے کہ فن کار کے کلام کا تجزیہ کر کے دیکھا جائے جو چیز اچھی ہے اسے سراہا جائے اور جو بری ہے۔ اس کو صرف اس لئے اچھا نہ کہا جائے کہ غالب سے منسوب ہے نہ ان اوصاف کو غالب سے منسوب کیا جائے جو اس میں موجود نہیں ہیں۔ غالب کی بڑائی کلام کی انہی خصوصیات سے واضح ہو سکتی ہے جو ایک خاص

رجحان یا عنصر کی حیثیت سے اس میں پائی جاتی ہیں۔ اب تک غالب پر چند ایسی کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں، جو بالکل مخالفانہ نقطۂ نظر سے بحث کرتی ہیں اور غالب کی بہت سی واقعی خوبیوں سے بھی انکار کرتی ہیں اور اس طرح غالب کے ان حریفوں کی حمایت کرتی ہیں جو غالب کی زندگی میں اسے سمجھ نہ سکے اور منفی پہلو پر ہی زور دیتے رہے شاید اسی کا ردعمل ہے کہ غالب پرستی کا رجحان اور تیز ہو رہا ہے غالب، ہو یا کوئی اور فن کار اس کے کلام کو تنقیدی نقطۂ نظر سے سراہنا یا اس پر نکتہ چینی کرنا برا نہیں مگر دونوں کے درمیان ایک ایسا فاصلہ ہونا چاہیے جو عقیدت اور عداوت سے خالی ہو ان حالات میں جہان غالب وقت اور خود کلام غالب کے بہت سے مطالبوں اور تقاضوں کو پورا کرتی ہے اور غالب کے ماحول سے لے کر اس کے فلسفۂ زندگی تک تحقیق اور تنقید کی سیدھی شاہراہ پر چلتی ہے اس میں نہ مخالفانہ نقطۂ نظر ہے۔ نہ غالب پرستی کا غیر معتدل رجحان" (جہانِ غالب صفحہ ۷، ۸)

اس پوری عبارت کو پڑھ کر ایک ذہین قاری میرے آئندہ طریقِ عمل سے اچھی طرح واقف ہو سکتا ہے جہاں تک مضمون نگار کا تعلق ہے ان کو بھی یہ فیصلہ کر لینا چاہیے تھا کہ جہاں غالب کے کلام میں فلسفہ زندگی کی موجودگی سے انکار کیا گیا ہے وہاں بہت سی شاعرانہ خصوصیات کا کھلے دل سے اعتراف بھی کیا گیا ہے ہو سکتا ہے کہ میں پیش لفظ کی پل صراط پر چلتے چلتے ڈگمگا گیا ہوں اس لغزش کو مستانہ کہا جاتا تو ایک حد تک ٹھیک ہو سکتا تھا لیکن اس میں مخصوص جذبات کی کھوج یقیناً مناسب نہیں، غالب اور کلام غالب کی بلندیوں اور عظمتوں کا جس ڈھنگ سے اعتراف کیا گیا ہے۔ اس کی چند مثالیں دیکھیے۔

• ان کی فارسی استعداد بہت اچھی تھی۔ ملا عبدالصمد سے انہوں نے پڑھا ہو یا نہ پڑھا ہو اس میں شبہ نہیں کہ اساتذہ فارسی کے کلام کا مطالعہ نہایت گہری نظر سے کیا تھا وہ ایران نہیں گئے نہ وہاں کے دیہات میں رہ کر محاورہ زبان کی مشق بہم پہنچائی لیکن پوری ذہانت اور دانشوری کے ساتھ اساتذہ کے کلام کو پڑھا اور اس طرح فارسی پر اپنی گرفت کو مضبوط کیا۔" (صفحہ ۳۰)۔

• اکثر فارسی اشعار کو انہوں نے دلچسپ اسلوب میں ڈھال کر اردو میں منتقل کیا ہے۔ (۳۷)

اردو خطوط غالب کی نثر نگاری کا ایک انقلاب خیز اور فکر انگیز نمونہ ہیں۔ (ص ۴۴)

• یہی پرکاری اور شوخی ہے جو ان کی شخصیت کے آئینے سے گزر کر کلام پر عکس فگن ہوتی ہے۔ اور اسلوب میں جدت اور ندرت کی شکل میں جھلکتی ہے۔" (ص ۴۷)

• اپنی طبیعت کے لحاظ سے غالب آزاد اور رند مشرب آدمی تھے، انہوں نے بڑی بے باکی سے آپ ہی اپنی کمزوریوں کو داشگاف کر دیا ہے حقائق کے بیان میں ان کا قلم اتنا ہی نڈر اور بے باک ہے جتنا جہانگیر کا تھا۔" (ص ۴۸)

•غالب کی زندگی اور شاعری پر حسن پرستی کے احساس کا رنگ بہت نمایاں ہے۔ وہ نہایت بیباکی انہماک خلوص اور سادگی سے حسن کا تذکرہ کرتے ہیں اور ان کے عشقیہ اشعار نہایت لطف اور پاکیزگی کے حامل ہیں۔ (ص ۱۱۳)

" غالب نے اردو نثر میں اپنے خطوط سے بیش بہا اضافہ کیا ہے اور نثر نگاری کی تاریخ میں انقلاب پیدا کیا ہے۔ انہوں نے مراسلے کو واقعی مکالمہ بنا دیا ہے نثر کا یہ رواں دواں برجستہ اور دل نشین پیرایہ اردو میں تو بالکل نیا تھا۔ (ص ۸۸)

• کوئی شبہ نہیں کہ غالب کے یہاں ایسی ترکیبیں موجود ہیں جو عام بول چال سے بالکل الگ ہیں لیکن ایسی جدید اور نادر تشبیہات کی بھی کمی نہیں جو اظہار مطالب کے لئے نہایت موزوں ہیں غالب دو الفاظ کو ملا کر ان سے مکمل تصویر بنا دیتے ہیں۔ موج نگاہ۔ دامِ تمنا۔ وادیٔ خیال اور اسی قسم کی بہت سی ترکیبیں اور استعارے ان کے یہاں پائے جاتے ہیں جن کے اندر معانی کا سمندر بند ہو جاتا ہے نئی تشبیہات و استعارات کے سلسلے میں غالب نہ صرف اردو بلکہ دنیا کی اور بڑی زبانوں کے شاعروں میں بھی امتیاز کے مالک ہیں۔ (ص ۲۱۵)

"اس تمام گفتگو سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ غالب اپنے اسلوب پیرایۂ اظہار طرز ادا اور انداز بیان کے اعتبار سے وہ شرف و امتیاز رکھتے ہیں جو کسی شاعر کو محض اس کے خیال کی بلندی اور فکر و خیال کی رفعت کے تحت حاصل نہیں ہو جایا کرتا کیونکہ جب تک جدت بیان واسلوب حاصل نہ ہو اس وقت تک معنی آفرینی بیکار رہی رہتی ہے۔ (۲۱۹)

لیکن یہ خودستائی اگر کسی اچھے شاعرانہ پیرائے میں ہو تو اس میں حسن پیدا ہو جاتا ہے غالب اپنے سب سے بڑے مداح ہیں ان کا ایگو (EGO) ہر جگہ نمایاں ہوتا ہے: (ص ۲۲۱)

"غالب کو محض اسلوب ہی کا شاعر نہ سمجھنا چاہئے خیالات کی بلندی نگاہ کی باریک بینی اور شعور کی نکتہ آفرینی کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہئے۔" (ص ۲۱۴)

• غالب کا شمار بھی ان شاعروں میں کیا جا سکتا ہے جو قدیم روش اور فرجام سے ہٹ کر اپنی زبان بناتے ہیں نئی تشبیہات اختراع کرتے ہیں خوبصورت استعارے وضع کرتے ہیں: (۲۲۷)

• غالب نے اردو شاعری کو ایک نیا اسلوب دیا انہوں نے زبان کے مقبول اور مروجہ اسلوب کو چھوڑ کر ایک نیا راستہ بنایا۔" (ص ۲۲۸)

• غالب کی شخصیت میں فکری عنصر نمایاں ہے" (ص ۲۳۰)

ان اقتباسات کی روشنی میں کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ پورا پیش لفظ پڑھنے سے احساس ہوتا ہے کہ مصنف میزان عدل کو قائم رکھے گا مگر مصنف نے اس رفعت اور اونچی جگہ کا انجام یہ دکھایا ہے: (پیش لفظ کا ایک حصہ)

• اگر رجائیت کو روشنی اور قنوطیت کو تاریکی فرض کر لیا جائے اور اس سے انکار ممکن بھی نہیں کہ ان دونوں میں یہی نسبت پائی جاتی ہے تو اس حقیقت کا تجسس ایک ادبی فریضہ بن جاتا ہے کہ غالب ہمیں روشنی زیادہ دیتے ہیں یا ذہن میں جلتے ہوئے چراغ بجھا کر تاریکی میں اضافہ کرتے ہیں۔" (۲۵۱)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مضمون نگار غالب پر کسی قسم کی نکتہ چینی ہی کو جائز نہیں قرار دیتے وہ چاہتے ہیں کہ انہیں ہر قسم کی لغزش سے پاک سمجھا جائے ہونا یہ چاہئے تھا کہ اعتراض کرنے سے پہلے غالب کے کلام میں رجائیت کا کوئی ایسا مسلسل مربوط اور ناقابل شکست فلسفہ تلاش کیا جاتا جس سے بقول مضمون نگار میرے اس نتیجۂ تجسس کی تکذیب ہو جاتی۔

• ایسا ادب جو غم اور مسرت کے باہمی امتیاز کو مٹانے اور آلام کے ساتھ مسرتوں کو بھی ناقابل التفات قرار دے وہ زندگی کا ادب نہیں اور جس ادب کو زندگی سے ربط نہ ہو اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ غالب کا یہ نظریۂ حیات کسی وقت بھی قابل تسلیم نہیں تاریکی اور روشنی کے درمیان فرق ہمیشہ باقی رہے گا جو شاعر اسے فنا کرنا چاہے وہ بصارت اور بصیرت دونوں سے خالی سمجھا جائیگا۔"

قدرت صاحب نے اسی سلسلے میں ان اشعار کو غلط سمجھنے کا الزام عاید کیا ہے۔

برد بہ شادی و اندوہ دل منہ کہ قضا۔ چو قرعہ بر نمط امتحاں بگرداند۔
یزید را بہ بساط خلیفہ بنشاند حکیم را بہ لباس شباں بگرداند

اکرام صاحب نے بھی انہی اشعار کو اپنی کتاب کے تیسرے حصے میں زندگی کے عنوان سے منتخب کیا ہے مضمون نگار نے ایک شعر چھوڑ دیا ہے۔

نوا بالی از خلۂ خار دنگی کہ سپہر سر حسین علی بر سناں بگرداند

قدرت صاحب اشعار مذکورۂ بالا کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

• ان دونوں کو (یعنی خوشی اور غم کو) حقیقت یا زندگی کے اصل اصولوں کا مرتبہ نہیں دینا چاہئے۔"

• اگر زندگی انسانی فلاح اور مسرت کی مسلسل جستجو کا نام ہے تو خوشی کو اہمیت کیوں نہ دی جائے۔"

یہ تمام گفتگو فلسفۂ حیات سے متعلق ہے جس کی موجودگی سے انکار کیا جارہا ہے لیکن غالب کے سماجی حالات کا خیال کرتے ہوئے غالب کو معذور بھی رکھا گیا ہے۔

• لیکن کوئی خاص پیغام اور فلسفۂ حیات وہ پیش نہ کر سکے۔ در اصل کوئی ایسا نظریۂ حیات اس وقت موجود بھی نہیں تھا جو کسی ایک مذہب جماعت یا مدرسۂ فکر سے منسوب کیا جا سکتا اس لئے غالب سے اس کی امید نہیں نہیں رکھنی چاہئے۔" (۲۹۶)

" غالب نے کسی مخصوص فلسفۂ زندگی کو پیش کرنے کا ادعا کبھی نہیں کیا ان کا اصل کام زبان کی صفائی درستی اور توسیع تھا اس مقصد کو انہوں نے جدید تشبیہات استعارات کی اختراع اور ایک اچھوتے اسلوب سے انجام دیا ہے۔ غالب پر ان نکتہ سنج ناقدوں کے کسی فعل کی ذمہ داری عاید نہیں ہوتی جو ہر چیز ان کے کلام میں تلاش کرتے ہیں" (ص ۲۹۸/۲۹۹)

مضمون نگار نے غالب کا یہ شعر۔

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری کچھ شاعری ہی باعث عزت نہیں مجھے

نقل کر کے بہت سے الزامات عاید کئے ہیں، انہیں سوچنا چاہئے تھا کہ بعض اشعار مختلف انداز سے یاد رہ جاتے ہیں۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ مختلف مقامات پر ان کا اندراج یکساں نہیں ہوتا۔ میں "سو پشت" کی جگہ "سو سال" پڑھتا رہا ہوں مسودے میں بھی یہی الفاظ ہیں" کاپی درست کرنے یا پروف پڑھنے والے نے "سو سال" پر خط کھینچ لکھ دیا ہے "سو پشت" چاہیے۔ مگر انہوں نے اس عبارت کو غور سے نہیں دیکھا

" ان کے اسلاف فوج سے تعلق رکھتے تھے جو شمشیر وسناں اور گرز و تیر سے اپنی مردانہ صفات کا ثبوت دیتے تھے اس خاندان کے افراد ایک صدی تک خاک و خون کی ہولی کھیلتے رہے غالب نے بڑے فخر سے اس کا ذکر کیا ہے ذاتی طور پر انہیں شاعری کے ذریعہ امتیاز حاصل ہوا تھا مگر انہیں اپنے اجداد کی سو سالہ سپہ گری پر ناز ہے جو انہیں معاصرین سے ممتاز کرتی تھی "

اس عبارت میں ایک صدی اور سو سالہ کا لفظ موجود ہے جو اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ مصرعہ اولیٰ یوں درج کیا گیا ہے۔

سو سال سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری

سو پشت سے "سو سال" مراد نہیں لے سکتا تھا۔ اگرچہ آغا محمد باقر صاحب ایم اے نے بیان غالب میں پشت سے سال ہی مراد لیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

میرے آباد اجداد کا پیشہ سو سال سے سپہ گری ہے اور یہی پیشہ میرے لئے باعث فخر ہے۔

بیان غالب، شرح دیوان غالب (صفحہ ۲۲۶)

اس موقع پر یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ مورخین نے غالب کے اسلاف کا شجرہ چند پشتوں تک ہی ظاہر کیا ہے، اور جتنے نام بتائے گئے ہیں وہ زیادہ سے زیادہ ایک صدی پر ہی حاوی ہوتے ہیں غالب کی سو پشتوں کا شجرہ کوئی بڑے سے بڑا مورخ بھی تسلسل کے ساتھ مرتب نہیں کر سکتا، غالب نے سو پشت لکھ کر شاعرانہ مبالغہ ہی کیا ہے زیادہ حقیقت اور واقعیت "سو سال" پڑھنے ہی میں ہے، رہا "ذریعہ" اور "یہی باعث"

کا معاملہ تو ظاہر ہے کہ یہ اعتراض برائے اعتراض ہے مضمون نگار کے الفاظ سے کوئی عالمانہ کردار نہیں جھلکتا

ایک جگہ رقمطراز ہیں۔

"غلام حسین خاں کو غالب کا خسر بتا دینا انتہائی درجہ ناواقفیت کی دلیل ہے غلام حسین خاں غالب کے نانا تھے اور غالب کے خسر نواب الٰہی بخش معروف تھے"

اور جہان غالب ہی کی اس تحریر کو نظر انداز کر دینا غالباً بڑی واقفیت کی دلیل ہے۔ مضمون نگار کا یہ تجاہل عارفانہ تنقیدی ذمہ داری کے قطعی خلاف ہے انہوں نے جہانِ غالب کا صفحہ ۱۸ ضرور پڑھا ہوگا۔ جس پر لکھا ہے۔۔

• غالب کے نانا خواجہ غلام حسین سرکار میرٹھ کے معزز عہدیدار تھے اور آگرے کے عائدین میں شمار ہوتے تھے

اس موقعے پر انہیں دیانت سے کام لے کر صرف یہی لکھ دینا چاہئے تھا کہ صفحہ ۱۸ اور صفحہ ۴۹ پر یہ متضاد بیانات کیوں نظر آتے ہیں اور اس کی کیا وجہ ہے نواب الٰہی بخش کے متعلق جہان غالب ہی میں بتایا گیا ہے۔

• ان کی شادی میرزا الٰہی بخش کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ (ص ۱۰۵)

پھر امراؤ بیگم کی درخواست پر بھی مضمون نگار کی نگاہ پڑی ہوگی جہاں لکھا ہے "امراؤ بیگم بنت الٰہی بخش"

جہانِ غالب ہی کی شہادت سے ظاہر ہے کہ مصنف ان رشتوں سے واقف ہے اس کی تاریخ دانی کی قلعی کھولنے سے پہلے اگر یہ سوچ لیا جاتا کہ مصنف ہندوستان میں ہے اور کتاب چھپی ہے لاہور میں ایسی صورت میں اسے کاپیوں کی تصحیح اور پروف پڑھنے کا موقعہ نہیں ملا ہوگا اگر یہ موقعہ مجھے نصیب ہو جاتا تو یقیناً یہ سقم باقی نہ رہتا اغلاط نامہ مرتب ہو کر چھپ رہا ہے اس میں عبارت درست کر دی گئی ہے۔

غالب کے جس خط کی چند سطور مضمون نگار نے نقل کی ہیں اس کو جب تک پورا نہ پڑھا جائے اس وقت تک اصل مفہوم واضح نہیں ہوتا اور یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس سے غالب کا مقصد کیا تھا۔

"حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت بعد تسلیم معروض ہے کہ آج شہر میں شہرت ہے کہ حضرت امیرالمومنین نے مفتی صدرالدین مرحوم کی زوجہ کو پانچ سو روپے مفتی جی کی تجہیز و تکفین کے واسطے رام پور سے بھیجے ہیں فقیر کو بھی توقع پڑی کہ میرا مردہ بے گور و کفن نہ رہے گا جیسا کہ مرزا جلال اسیر کہتا ہے۔

جرعۂ لطف تو بعد از ما بما خواہد رسید۔

میں نے کل ایک خط نواب مرزا خاں کو لکھا ہے خدا جانے وہ حضرت کی نظر سے گزرے یا نہ گزرے اس خط میں میں نے زوجہ مفتی جی کا حال یہ لکھا ہے کہ وہ لاولد ہے اور ساٹھ روپے کرائے کے مکان اس کے تحت میں ہیں۔ ابن الرحمان (آزردہ نے احسان الرحمان نام لکھا ہے) اس کا بھانجا ہے۔ مفتی جی کا کوئی نہیں اب اپنی حقیقت

عرض کرتا ہوں اور آخر عمر میں تین التجائیں ہیں آپ سے ایک تو یہ کہ میں ہزار بارہ سو کا قرض رکھتا ہوں. چاہتا ہوں کہ میری زندگی میں ادا ہو جائے دوسرا التماس یہ ہے کہ حسین علی خاں کی شادی آپ کی بخشش خاص سے ہو جائے اور یہ سو روپے مہینہ جو مجھے ملتا ہے اس کے نام پر اس کے حین حیات قرار پائے یہ دو خواہشیں خواہ میری زندگی میں خواہ میرے بعد اجرا پائیں۔

تم سلامت رہو ہزار برس　　　دولت و عز و جاہ روز افزوں

مفتی صاحب کی بیوہ کو رقم واقعی مل چکی ہے اور بقول مضمون نگار غالب نے یہ کبھی نہیں لکھا کہ مفتی صاحب کی بیوہ کی مدد نہ کی جائے لیکن ان کی حیثیت کے اظہار سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی ناداری اور کم مائیگی کو واضح کر رہے ہیں جس کا مقصد صرف یہ ہے کہ نواب کی توجہ مفتی صاحب کی زوجہ سے ہٹ کر ان کی ذات پر مرکوز ہو جائے پھر انہیں لاولد کہہ کر یہ بتانا کہ امین الرحمٰن مفتی جی کا کوئی نہیں ان کی بیوی کا بھانجا ہے اسی کے ساتھ حسین علی خاں کا ذکر اور اس کی شادی کے سلسلہ میں امداد کی درخواست سے پتہ چلتا ہے کہ غالب کیا چاہتے ہیں۔ امین الرحمٰن اگر مفتی صاحب کا کچھ نہیں تھا تو حسین علی خاں غالب کے کون تھے، غالباً انہی باتوں کا اثر تھا کہ غالب کا قرض رام پور سے ادا نہیں کیا گیا حسین علی خاں کی شادی کے لئے بھی روپیہ نہیں ملا البتہ انہیں پچیس[۲۵] روپیہ ماہوار منصب مل گیا؛

جہان غالب میں جن کتابوں کے حوالے موجود ہیں ان کے پیش نظر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ "غالب کی تحریروں کے اقتباسات کا صحیح مآخذ مصنف کی نظر میں نہیں" مضمون نگار سہو کتابت سے شعوری طور پر فائدہ اٹھاتے ہوئے قارئین کو پھر ایک حسین مغالطہ دیتا ہے:

"اس کے مآخذ کی نشاندہی میں غالب از قتیل لکھا ہے حالانکہ غالب کے متعلق قتیل نے کوئی کتاب نہیں لکھی دراصل کتاب کا نام غالب اور قتیل ہے"

اگر مضمون نگار اس عبارت کے آخر میں صرف اتنا اور لکھ دیتا (جیسا کہ اسی صفحہ کی گیارہویں سطر میں مرقوم ہے) تو معاملہ صاف ہو جاتا اور مضمون نگار کی دیانت داری پر کوئی حرف نہ آتا لیکن مطلب تو صرف اعتراض کرنا ہے۔ اور وہ بھی حقائق کو چھپا کر، قتیل نے غالب پر یقیناً کوئی کتاب نہیں لکھی نہ ایسا ممکن تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ جہان غالب کے آخر میں جو حوالے دیئے گئے ہیں ان میں صفحہ ۳۱۶ پر غالب کا علمی پس منظر" کے ذیل میں ایک جگہ کاتب نے " غالب از قتیل" لکھ دیا ہے مضمون نگار نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر ایک اعتراض کا اور اضافہ کر دیا ستم بالائے ستم یہ کہ علامہ نیاز فتحپوری کو بھی اپنے ناوک بیداد کا شکار بنا لیا۔ اگر مضمون نگار صرف ۹ سطر کے بعد ہی غالب کا ضابطۂ رومان" والے حوالوں پر نظر ڈال لیتا اور پھر اس سے اگلے عنوان کے حوالوں کو دیکھنے کی زحمت برداشت

کرتا تو معلوم ہو جاتا کہ اصل ماخذ غالب اور قتیل ہے کاتب نے پہلے باب میں اور کی جگہ از لکھ دیا ہے یہ تو ناممکن ہے کہ مضمون نگار نے آئندہ ابواب میں غالب اور قتیل نہ پڑھا ہو انہیں کاتب کی اس لغزش سے فائدہ اٹھا کر (اللہ آئندہ حوالوں) سے دانستہ صرف نظر کر کے اعتراضات کی فہرست طویل کر لی تھی ــــ غالب اور قتیل سید اسد علی انوری فرید آبادی۔ بی۔ ایس۔ سی۔ علیگ) آئی۔ ایف۔ ایس کی تصنیف ہے اور ۱۹۳۹ء میں جید برقی پریس دہلی میں چھپی ہے یہ کوئی ایسا ماخذ نہ تھا جو دسترس سے باہر ہوتا۔

مضمون نگار لکھتے ہیں۔

غالب کے بعض اشعار کو قدیم شعراء سے ماخوذ و مستعار بتایا اس باب میں بڑی کوتاہی یہ ہے کہ صرف اشعار لکھ دیئے ہیں محاکمہ نہیں کیا گیا۔

اس میں شک نہیں کہ تمام اشعار پر الگ الگ محاکمہ کی ضرورت نہیں سمجھی گئی لیکن مجموعی طور پر اظہار خیال کر دیا گیا ہے جو پورے باب پر حاوی ہے چند عبارتیں ملاحظہ فرمائیے۔

" انہوں نے اپنے اسلوب کی طاقت سے فائدہ اٹھا کر اپنے افکار و خیالات اور اخذ و اقتباسات کے ذریعہ حاصل کئے ہوئے مواد کے لئے ایسا ظرف منتخب کیا ہے جس میں سما کر ہر خیال ایک رنگین سیال اور میٹھے مشروب کی مانند جاذب نظر دلفریب اور لذت بخش ہو جاتا ہے " (ص ۲۱۱)

" غالب دوسروں کے تخیلات کو اپنا کر ان میں ایک نئی روح پھونک دیتے ہیں۔ اس طرح پرانے خیالات ازسر نو زندہ ہو کر زبان کے بڑھتے ہوئے ذخیرے میں شامل ہو جاتے ہیں۔" (ص ۲۱۴)

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ غالب کا پیرایۂ اظہار نہایت نادر اچھوتا اور دل میں اتر جانے والا ہے وہ فرسودہ اور پامال مضامین کو بھی اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ ان کی سطح بلند ہو جاتی ہے اور فرسودگی، یا پامالی کا بالکل احساس نہیں ہوتا " (ص ۲۱۸)

آخر میں ایک بار یہ اور عرض کر دوں کہ جہان غالب پیش کر کے صاحبان علم و ادب کو دعوت فکر دی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا جائے اس کا لب و لہجہ متوازن اور سنجیدہ ہونا چاہئے۔ قدرت صاحب جس قدر چاہیں لکھیں مگر مجھ سے جواب الجواب کی توقع نہ رکھیں ــــ میں نے بقول ان کے مبتدیوں کو گمراہ کیا ہے مگر وہ منتہی حضرات کو بھی گمراہ کر رہے ہیں۔

سیّد قدرت نقوی

معادل کی تلاش

ستمبر ۶۵ء کی جنگ کا پوری قوم پر ایک زبردست نفسیاتی ردِعمل یہ ہوا کہ ہم میں خود فکری انداز ابھرنے لگا ہے۔ اسی انداز سے قومی شعور کی بیداری کا پتہ چلتا ہے۔ اب ہم شدت سے یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ ہمارے پاس اپنا کیا ہے؟ اور جو اپنا نہیں ہے اسے کس طرح اپنا بنالیں۔ یہ جذبہ زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ادب میں بھی رونما ہونے لگا ہے۔ یہ ادبی ترقی کے لئے ایک نیک فال ہے۔ لیکن ابھی تک ہمارے ہاں ایک طبقہ ہر شعبہ حیات میں ایسا پایا جاتا ہے جو اپنے قومی احساس میں خود بھی احساس کمتری کا شکار ہے اور دوسروں کو بھی اسی احساس کا شکار بنانے میں کوشاں نظر آتا ہے۔ وہ غیروں کی برتری کے گن گا گا کر خوش ہوتا اور اپنی دانست میں اس کارنامے کو سرمایۂ افتخار سمجھتا ہے۔ اپنے ملکی اور قومی سرمایۂ ادب کو قابلِ اعتنا نہیں گردانتا اپنے ادیبوں اور شاعروں کو غیروں کے مقابلے میں کوئی رتبہ دینے کے لئے تیار نہیں۔ ان میں اس طبقہ کو عظمت کا کوئی نشان نظر نہیں آتا۔ یہ طبقہ وہ ہے۔ جس نے اپنے ملک و قوم کی تاریخ کا گہرا مطالعہ نہیں کیا۔ اپنے آباد اجداد کی تہذیبی اقدار سے واقف نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر ادیب و شاعر اور اس کے فن کو اس کے دور کی تاریخ اور تہذیبی اقدار کی روشنی میں جانچنا اور پرکھنا چاہیئے۔ حق و انصاف کا یہی تقاضہ ہے۔ آج کے تہذیبی عوامل اور عوامی تقاضوں کے اظہار کی توقع اب سے بیس تیس برس ہی پہلے کے ادیب و شاعر سے رکھنی ایک لایعنی امر ہے۔ چہ جائیکہ ایک دو صدی پہلے کے ادیب و شاعر سے۔ اس لئے منفی نظریہ رکھنے والے طبقہ کو سکونِ قلب سے غور کرنا چاہیئے کہ ہم کیا ہیں اور ہمیں کیا بننا چاہیئے۔؟

مقصدی اعتبار سے ہم ابھی عبوری دور میں ہیں۔ عبوری دور میں کوئی متعینہ امر نہیں ہوتا۔ بلکہ متعین و مستقر بنانے کی کوشش ہوا کرتی ہے۔ اس لئے ہمیں دنیا کی طرف سے آنکھیں تو بند نہیں کر لینی چاہئیں۔ بلکہ یہ کوشش ہونی چاہیئے۔ کہ ہم انتہائی تیز رفتاری سے کام کریں۔ اور اس کو استقلال بخشیں۔ اگرچہ ۴۷ء میں ہماری ملکی و قومی زندگی میں ایک موڑ آیا۔ جس کی بدولت علم و ادب میں بھی ٹھوس کام ہونے لگے۔ تخلیقی ادب

میں بھی ایک نیا شعور کار فرما ہوا۔ تنقیدی و تحقیقی کام کی رفتار بھی تیز ہو گئی۔ اُردو کو قومی زبان بنانے کے لئے کوششیں بروئے کار آئیں۔ اسی ضمن میں، بیان و اظہار کی صلاحیتوں کو وسیع تر بنانے کے لئے بیرونی علوم و فنون کی اصطلاحات کے تراجم پر زور دیا جانے لگا۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کے بعد سے یہ احساس قوی تر ہو گیا کہ ملکی و قومی امور کی انجام دہی کے لئے ملکی و قومی زبان ہی موثر ترین ذریعہ ہے۔ یہ کام غیر ملکی زبان سرانجام نہیں دے سکتی اور اب بیش از بیش اس طرف توجہ مرکوز ہے کہ اپنی قومی زبان و ادب کو عظمت و فوقیت دی جائے۔

میرا شروع ہی سے یہ نظریہ رہا ہے کہ بے شک ہم اس ترقی کی دوڑ میں دوسری اقوام کی ہمسری نہیں کر سکتے کیونکہ اتفاق ہے کہ انہوں نے ہم سے پہلے ترقی کے میدان میں قدم رکھا۔ لیکن اگر ہم اس احساس میں مبتلا ہو گئے کہ وہ ہم سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ خود احساس کمتری کا شکار ہو جائیں تو یقیناً ہمارے لئے یہ پستی اور زوال کا راستہ ثابت ہوگا۔ بلکہ ہم میں رشک پیدا ہونا چاہیئے۔ تاکہ مقابلہ و مسابقہ کا جذبہ ابھرے اور ہم ترقی کے راستے پر گامزن ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ انگریزی کے توسل سے ہمارے ادب و تنقید میں نئے اسالیب و اصول آئے اور آج ہم نے ان کو قبول کر رکھا ہے۔ لیکن ان اسالیب و اصول کے سلسلے میں اب یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ ہم ان میں ایسا رنگ بھریں کہ یہ ہماری اپنی چیزیں بن جائیں۔ ان کی غیریت و غرابت کو دور کر کے اپنائیت اور مانوسیت پیدا کرنی چاہیئے۔ اس سلسلے میں ہمیں اپنے قدیم سرمایہ کی طرف بھی نظر ڈال کر دیکھنے کی ضرورت ہے۔ کہ ان اسالیب و اصول کا سلسلہ ہماری ادبی و تنقیدی روایات سے کسی طرح مل سکتا ہے یا نہیں۔؟ اس طرح مانوسیت کو تقویت ہوگی۔

میں اپنے مضامین میں اس امر کی نشاندہی کر چکا ہوں کہ اصطلاحات وغیرہ کا ترجمہ کرتے وقت کیا طریقہ کار اختیار کرنا چاہیئے: غیر ملکی بالخصوص یوروپی علوم و فنون سے استفادہ کرنے کے لئے انہیں اپنی قومی زبان میں منتقل کرنا ازبس ضروری ہے۔ ان علوم و فنون کی اصطلاحات کے متعلق میرا نظریہ یہ ہے کہ اگر کسی اصطلاح کا معادل پہلے سے قومی زبان میں موجود ہے تو اس کو استعمال کرنا چاہیئے، جیسے "METAPHOR" کا معادل "استعارہ" موجود و مروج ہے۔ اس لئے استعارہ استعمال کرنا چاہیئے۔ اگر کسی اصطلاح کا معادل موجود و مروج نہیں ہے تو ہمیں سب سے پہلے ان زبانوں کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ جن کے کثیر الفاظ ہماری قومی زبان میں مروج ہیں۔ یعنی ہندی و سنسکرت، عربی، فارسی۔ اگر ان زبانوں میں اس کا معادل نہ ملے۔ تو پھر سب سے پہلی صورت یہ اختیار کرنی چاہیئے کہ اصطلاح زیر غور کو دیکھا جائے کہ وہ صوتی اعتبار سے ہماری قومی زبان کے مزاج و آہنگ سے مناسبت رکھتی ہے یا نہیں۔؟ اگر رکھتی ہے تو اس کو جوں کا توں قبول کر لینا انتہائی دانشمندانہ بات ہے اور اگر نہیں ہے تو پھر معنی کو ملحوظ رکھتے ہوئے۔ مرکب اصطلاح بنالی جائے۔ لیکن اس میں بھی مرکب کے

اجزائے ترکیبی کا عام اور مانوس ہونا ضروری ہے۔ اگر عام اور مانوس نہ ہوئے تو اس مرکب ترجمے اور غیر ملکی اصطلاح میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔ اس لئے اگر مناسب اجزائے ترکیبی نہ ہوں تو اس غیر ملکی اصطلاح کو بعینہٖ قبول کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ کیونکہ کثرتِ استعمال سے اس کی ثقالت و نامانوسیت یا مزاج و آہنگ زبان کی عدم مطابقت کا دور ہو جانا ممکن ہی نہیں، یقینی امر ہے۔

امورِ مذکورہ کے بعد آیئے ہم "IMAGE" اور "IMAGERY" کے متعلق غور کرتے ہیں یہ دونوں انگریزی تنقید میں بہت زیادہ استعمال کئے جاتے ہیں۔ ان کے لئے ایسے جامع الفاظ تلاش کئے جائیں جو ان کا مفہوم بخوبی ادا کر سکیں اور زبان میں بآسانی استعمال کئے جا سکیں۔ امیج "IMAGE" انگریزی زبان کا لفظ ہے۔ لغوی و اصطلاحی معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ انگریزی میں لغوی معنی، کسی شخص یا محسوس شے کا قائم مقام یا نمائندہ، کسی بچے کی اپنے والدین سے مشابہت۔ کسی محسوس شے کا پوجا کے لئے قائم ہونا (بت) کسی محسوس شے کی تصویر جو کسی محدب شیشے کے مرکز شعاعی پر یا کسی آئینے پر روشنی کی شعاعوں کے انعکاس سے بنے۔ اس کا ماخذ لاطینی زبان کا لفظ "IMAGO" ہے جہاں اس کے معنے یہی ہیں جو مذکور ہوئے۔ البتہ ایک معنی اور بھی ہیں یعنی کرم حیات کی آخری اور مکمل شکل۔ دراصل اسی معنی سے اصطلاح بنی ہے۔ یعنی اصطلاح میں "امیج" محسوس اشیاء کی الفاظ کی مدد سے ایسی تصویر وجود میں آنا۔ گویا وہ آنکھوں کے سامنے ہے۔ کیونکہ اس صورت کے بننے میں چشم تصور۔ منازل تخلیق اسی طرح طے کرتی ہے۔ جس طرح کرمِ حیات آخری اور مکمل شکل اختیار کرنے میں منازل طے کرتا ہے۔ جب چشم تصور میں تصویر مکمل ہو جاتی ہے تو اس کو "امیج" کہا جاتا ہے اور شاعری میں اس قسم کے عمل کو "امیجری" یعنی الفاظ کے ذریعے محسوس اشیاء کی ایسی تصویر پیش کرنا کہ گویا محسوس ہو کہ وہ شے ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہے اور ہم اس کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ کیونکہ شاعری میں ذریعہ اظہار و ابلاغ الفاظ اور ترکیبیں ہیں۔ اس لئے "امیجری" کی مختلف حالتیں ہو جاتی ہیں۔ ہر حالت کی مناسبت سے اس کے نام بدلتے چلے جاتے ہیں۔ یہ حالتیں فی الحال بحث طلب نہیں۔

امیج اور امیجری کی بحث کے بعد بہتر ہوگا کہ ان کے معادل تلاش کئے جائیں۔ ہمیں بظاہر ان کے معادل مروج نظر نہیں آتے۔ اس لئے اصولاً ہمیں سنسکرت، عربی اور فارسی میں اس کا معادل تلاش کرنا چاہیئے کیونکہ ہماری زبان میں بیشتر علوم و فنون کی اصطلاحات عربی و فارسی سے منتقل ہوئی ہیں۔ اس لئے سب سے پہلے انہی زبانوں میں تلاش مناسب ہوگی۔ موجودہ دور میں سب سے بڑی قباحت یہی ہے کہ ملک میں تعلیم یافتہ طبقہ دو گروہوں میں بٹا ہوا ہے۔ ایک وہ جو انگریزی سے بہرہ ور ہے۔ دوسرا وہ جو عربی و فارسی جانتا ہے۔ ان دو گروہوں میں وہ روابط و مراسم نہیں جو توسیع زبان کے لئے ضروری ہیں۔ اصولاً تو اصطلاحات

کے ترجمے کے لئے ایک وسطی گروہ کا ہونا ضروری ہے جو انگریزی کے ساتھ ساتھ عربی و فارسی میں بھی مہارت رکھتا ہو۔ ہمارے ہاں اس وسطی گروہ کا وجود تو ہے۔ مگر یا تو وہ عمدہً اس طرف توجہ نہیں کرتا۔ یا کرتا ہے تو اپنے رجحانِ طبع کی وجہ سے افراط و تفریط کا شکار ہو جاتا ہے۔ یا پھر اسے ادب سے وابستگی نہیں اس لئے یہ مسائل لاینحل بنے ہوئے ہیں۔ اگر یہ وسطی گروہ کوشش کرے اور بالغ نظری سے کام لے۔ ذوقِ سلیم کو اپنا رہنما بنائے افراط و تفریط کا شکار نہ ہو تو اس قسم کے مسائل جلد طے ہو سکتے ہیں۔

امیج اور امجری کے مذکورہ معنی اور تعریف کی روشنی میں، جب میں نے عربی و فارسی کی طرف رجوع کیا تو مجھے عربی میں ایک اصطلاح ملی جو عربی سے فارسی تک تو پہنچی مگر اردو میں اس اصطلاح کی دوسری باتیں تو پہنچ گئیں۔ لیکن وہ خود روپوش ہو گئی۔ ایک بڑی قباحت یہ بھی ہے کہ آج ہماری قدیم و جدید اصطلاحات کا مفہوم غیر متعین اس لئے ہے کہ اصطلاحات تو ہیں۔ مگر ان کی تحصیل و تعلیم کا تدریسی طریقہ نہیں رہا۔ ہر شخص اپنی منشا و مفہوم کے مطابق ان کے مختلف معنی مراد لے کر استعمال کرتا ہے مگر قاری کے ذہن میں عام طور پر لغوی معنی رہتے ہیں، اصطلاحی نہیں۔ یہی انتشار کا سبب ہے۔ اس انتشار نے بہت سی مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ سب سے پہلے اس انتشار کو دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ یعنی مفہوم کی تعیین انتہائی ضروری ہے۔ مثلاً ہمارے ہاں "معانی و بیان" مشہور ہے۔ بیان سے عموماً ذکر مراد لیتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بیان ذکر ہی کو کہتے ہیں۔ لیکن اصطلاح میں بیان، الفاظ کا اس طرح استعمال کرنا کہ وہ کلام میں اپنے معنی پر دلالت کریں اور معنی کے لوازمات ان میں ملحوظ ہوں۔ گویا ایک معنی کو کئی طرح بادلیل ادا کرنا بیان ہے۔ اس سلسلے میں تشبیہ۔ استعارہ، مجاز، کنایہ زیرِ بحث آتے ہیں۔ کیونکہ ان کے ذریعے الفاظ گوناگوں معنی ادا کرتے ہیں۔ یا ایک معنی کو کئی کئی طرح ادا کیا جاتا ہے۔ اسی طرح معانی حقائق گوناگوں اور سوانح مختلفہ کی صورتوں کا عکس ہے۔ یعنی حواسِ خمسۂ ظاہری کے ذریعے حواسِ باطنی کو حالات و واقعات کا ہر طرح کا علم ہوتا ہے۔ ان حالات و واقعات کے حقائق کی شعاعوں سے آئینۂ دماغ پر جو تصاویر بنتی ہیں۔ انہی کا انعکاس "شعور" کہلاتا ہے اور اسی شعور اور شعور سے پیدا ہونے والی کیفیات کا نام "معانی" ہے۔

عام حالات اور روزمرہ گفتگو میں بھی، اگرچہ ہم معانی کی تصویر کھینچتے ہیں لیکن اس تصویر میں اور ادب بالخصوص شعر کی تصویر میں فرق ہوتا ہے۔ شاعر کے دل پر جب کوئی چیز خاص طور پر اثر انداز ہوتی ہے تو وہ اس کو شعر کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ کبھی کبھی یہ حقیقت خارجی، بجائے خود اتنی حسین و دل کش ہوتی ہے کہ شاعر کی نگاہ اس کے دامِ حسن میں الجھ کر رہ جاتی ہے اس عالم میں وہ جو شعر کہتا ہے اس میں صورت کی ہو بہو تصویر پیش ہو جاتی ہے۔ ایسی شاعری کو عربی میں "وصف" کہتے ہیں۔ اس کے ضمن میں مختلف تصاویر آ جاتی ہیں مثلاً تصویرِ جذبات، تصویرِ خیال،

تصویرِ خیال۔ تصویرِ تخیل۔ تصویرِ فکر و حقیقت وغیرہ۔ ان سب کی تفصیل یہاں مقصود نہیں۔

حواس خمسہ ظاہری ذریعۂ علم ہیں۔ مگر ہر حس اپنی خاصیت کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتی۔ یعنی قوتِ باصرہ دیکھ سکتی ہے، سونگھ نہیں سکتی، یہ کام قوتِ شامہ سے مخصوص ہے۔ اسی طرح قوتِ لامسہ۔ سامعہ و ذائقہ اپنے اپنے ہی فرائض انجام دے سکتی ہیں۔ ایک دوسرے کے نہیں۔ لیکن ان سب کا مرکز دماغ ہے۔ گویا وہ ایک ایسی لوح ہے جو محسوساتِ خمسہ سے عکس پذیر ہوتی ہے۔ اس کو حسِ مشترک اور آئینۂ نفس بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ نفس کو اسی قوت کے ذریعے باہر کا علم ہوتا ہے یہی علم اولین صورت میں شعور کہلاتا ہے۔ اس شعور کے اثرات کا نام جذبات ہے۔ یہ شعورِ نفسانی کبھی پیدا ہوا اور کبھی ختم ہو گیا۔ کبھی باقی و قائم رہتا ہے۔ اس کو تصور کہتے ہیں۔ اگر تصور اس طرح قائم ہو جائے کہ نفس جب چاہے اس کا اعادہ کرے تو قیام و استقرار کی محافظ قوت کو حافظہ کہتے ہیں اور اعادہ کرنے والی قوت کو خیال۔ تصور۔ اور خیال میں تصرف کرنے والی قوت کو متصرفہ کہتے ہیں۔ قوتِ متصرفہ جب نظم و ترتیب قائم کرے تو متفکرہ کہلاتی ہے اور اگر جزئیات و صور میں تصرف کرے تو متخیلہ۔ بعض کے نزدیک خیال قوت پکڑ کر جب صورِ ذہنیہ میں تصرف و خلاقی کرتا ہے تو وہی واہمہ و متخیلہ کہلاتا ہے۔ بہر حال دماغ انسانی پر یہ کیفیات طاری ہوتی ہیں اور شعر کی تخلیق میں ان کا عمل رہتا ہے۔

یہ باتیں اس لئے بیان کی گئی ہیں کہ شعر کی تخلیق میں جو قوتیں کارفرما ہوتی ہیں ان کا عمل اور حیثیت سامنے آجائے۔ کیونکہ شاعر جو کچھ کہتا ہے وہ نتیجہ ہوتا ہے اس کے مشاہدے اور تجربے کا۔ مشاہدے اور تجربے کے دوران وہ کچھ نہیں کہتا۔ بلکہ دماغ اپنے معاون قویٰ کے ذریعے انہیں محفوظ کر لیتا ہے۔ اور پھر ان کے تاثر سے کیفیت پذیر ہو کر ان کی عکاسی کرتا ہے۔ اب اگر یہ عکاسی ایسی ہے کہ تصویر بالکل آنکھوں کے سامنے آجائے تو اس کو ہم وصف کہیں گے۔ پس وصف کی تعریف یہ ہوئی کہ شاعر جو حالت و کیفیت بیان کرے۔ اپنے سامعین کو بھی اسی عالم میں پہنچا دے۔ جہاں خود موجود ہے، تاکہ سن کر یہ محسوس ہونے لگے کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ آنکھوں کے سامنے ہے۔ چنانچہ وصف کے متعلق کہا جاتا ہے: "وصف وہ ہے جو کانوں کو آنکھ بنا دے": گویا وصف ہمارے سامنے بیان کی جانے والی حالت و کیفیت پیش کرنے کا نام ہے اس لئے "اجّ" کو "وصف" اور "زابجری" کو "صفیت" کہا جائے تو تطبیق ہو جاتی ہے۔ اب ان کی مختلف نوعیتیں ہیں۔ بیان کی اقسام میں بھی وصف کا دخل ہے، یعنی تشبیہ، استعارہ، مجاز و کنایہ میں بھی وصف ہے۔ کیونکہ ان میں بھی تصویر پائی جاتی ہے اور معانی تو کلیتہً ہی حالات و حقائقِ گوناگوں کے عکس ہی کو کہتے ہیں۔

غرض وصف کا شعر ایک قسم کی معنوی تصویر ہے۔ اگرچہ شاعر بہت کم کسی چیز کی پوری پوری تصویر کھینچتا ہے۔ اکثر جس چیز کا وصف کرنا چاہتا ہے۔ اس کی چند نمایاں پسندیدہ اور آنکھوں میں بسی ہوئی چند ایسی

خصوصیات چن لیتا ہے جو تصویر کی جان ہوتی ہیں اور انہی سے تصویر، سامع کی چشم تصور میں مکمل ہو جاتی ہے اور اس کو عالم خیال میں وہاں پہنچا دیتی ہے جہاں شاعر پہنچا تھا اور ذہنی طور پر اس تصویر سے محظوظ ہوتا ہے۔

وصف عام طور پر مناظر و مرئیات کی تصویر کو کہتے ہیں۔ لیکن شعر وصفی ہو یا غیر وصفی، بہرحال حقائق مرئیہ کا عکس نہیں، بلکہ عکس ہوتا ہے صور خیالیہ کا۔ اس لئے شعر کسی قسم کا ہو تصویر معنی ہوتا ہے اور شاعری معنوی مصوری یہ دوسری بات ہے کہ شعر صورت ذہنیہ پر منطبق ہوتے ہوتے کبھی صورت خارجیہ پر بھی منطبق ہو جائے۔ یا صورت خارجیہ شعری تصویر پر۔ شعر باستثنائے قدر قلیل وصف میں داخل ہے۔ وہ تشبیہ سے ملتا جلتا ہے لیکن تشبیہ نہیں۔ تشبیہ اکثر وصف ہی میں آتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ وصف خبر ہوتا ہے کسی حقیقت کی اور تشبیہ محض مجاز و تمثیل۔ بعض حضرات وصف کو محاکات سے تعبیر کرتے ہیں اور تخییل کو اس کا مقابل بتاتے ہیں اس طرح حکائی اور تخییلی اقسام ہو جاتی ہیں۔ محاکات کی تعریف میں اختلاف ہے۔ لیکن اکثر کے نزدیک یہ تعریف ہے کہ کسی شئے یا حالت کو الفاظ میں اس طرح ادا کیا جائے کہ اس کی تصویر نظر کے سامنے آ جائے۔ محاکات جذبات و افکار کے نتائج کو محیط نہیں ہے۔ تخییل کے متعلق بھی یہی ہے کیونکہ حس بصر کے ذریعے جن اشیاء کی شبیہہ دماغ تک پہنچتی ہے۔ وہ قوت متخیلہ کو تصورات و اشکال کی نعمت بخشتی ہے اور تخییل کی تفریحات انہی اشیاء سے مہیا ہوتی ہیں جنہیں ہم نے دیکھا ہو خواہ اس وقت جب کہ وہ ہمارے سامنے موجود ہوں یا اس وقت جب تصویر، مجسمے یا الفاظ میں ان کے بیان سے ان کا تصور ہمارے پیش نظر ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ قوت متخیلہ، کوئی شبیہہ بھی ایسی پیش نہیں کر سکتی جو حس بصر کے ذریعے حاصل نہ ہوئی ہو۔ یہ ضرور ہے کہ ان شبیہوں کو محفوظ رکھنے، تبدیل کرنے یا ان میں اضافہ کرنے کی قوت ہمارے اندر موجود ہے۔

شعر میں پیش کی جانے والی تصویر خواہ حکائی ہو یا تخییلی یا فکری یا جذباتی وہ داخل وصف ہے۔ کیونکہ یہ سب تصویر معانی ہیں اور تصویر معانی کا دوسرا نام وصف ہے اس لئے "امیج" کو وصف کہنا زیادہ مناسب ہے۔ اگرچہ بعض نے امیج کا ترجمہ، تصور، خیالی تصویر، صورت، مجسمہ، ہیئت اور شکل کیا ہے۔ مگر اصطلاح ادب کے طور پر میرے نزدیک وصف بہتر ہے۔ اگر امیج کو محسوس (مرئی) اشیاء کی تصویر تک محدود خیال کیا جائے تو اس صورت میں وصف، امیج سے برتر اور افضل ہے۔ کیونکہ وصف میں محسوس (مرئی) غیر محسوس (غیر مرئی) دونوں کی تصویر پیش کی جا سکتی ہے۔ بعض نے "امیجری" کا ترجمہ تصویر آفرینی کیا ہے۔ ان کے مقصد کے لحاظ سے یہ ترجمہ بھی اس لئے درست نہیں کہ لفظ تصویر مادی و محسوس اشیاء تک محدود ہے اور اس صورت میں امیج کا ترجمہ تصویر آفرینی ہو گا تو اس سے کہیں بہتر یہ ہے کہ ہم "امیج" کے لئے "تصور" اور "امیجری" کے لئے "تصوریت" اختیار کر لیں۔ پس اگر محسوس اشیاء کی تصویر کشی کو مقصود بنایا جائے تو تصور و تصوریت

اور اگر مطلق تصویر خواہ وہ محسوس اشیاء کی ہو یا فکر وخیال کی۔ تو پھر وصف اور وصفیت مناسب ہے۔

معادل کی اس تلاش وجستجو کے بعد امیج اور امیجری کے متعلق لسانیات کی روشنی میں غور کرتے ہیں تو یہ صوتی اعتبار سے قومی زبان میں رچ بس جانے کے قابل نظر آتا ہے۔ کیونکہ "وصف" بھی عام نہیں ہے۔ اس لئے اب وہ دونوں لفظ ایک ہی جیسے ہیں۔ دونوں کے اختیار کی منزل یکساں ہے۔ "وصف" ہر طبقے کے لئے اجنبی ہے۔ اور امیج کم ازکم انگریزی داں طبقے کے لئے معروف وآشنا ہے۔ اس لئے اگر "امیج" ہی کو اختیار کرلیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ البتہ یہ ضرور ہونا چاہیئے کہ اس کا مفہوم متعین اور استعمال کا اصول مقرر کرلیا جائے لیکن اگر "امیج" کا معادل "تصور" قرار پاتا ہے تو پھر "تصور" کو ہر حال میں فوقیت حاصل ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم تصور کو معادل قرار دے لیں تو یہ نہایت ہی مناسب ہے۔ تصور ہر حیثیت وہر حالت میں امیج کے ادبی وتنقیدی مفہوم کو محیط ہوسکتا ہے مثلاً غالب کے کلام میں تصوریت (امیجری) کی بہتات ہے۔ غالب نے مختلف حیثیت سے تصوریت کی تکمیل چابکدستی سے کی ہے:

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز   پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

کہہ سکتے ہیں کہ اس شعر میں ایک مکمل حسین تصور (امیج) ہے یا:

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس   برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

اس شعر میں یکے بعد دیگرے کئی تصور (امیج) ہمارے سامنے آتے ہیں اور بھرپور تاثر چھوڑتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام پاپڑ بیلنے اسی وقت درست ہیں جب ہم قومی شعور سے کام لیں اور اس بات کا عزم کرلیں کہ ہم اپنی قومی زبان کو فروغ وفوقیت دیں گے۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ الفاظ کی زندگی استعمال پر منحصر ہے۔ اگر استعمال ترک کردیا جائے تو الفاظ مرجاتے ہیں۔ اسی طرح نئے الفاظ کو استعمال نہ کیا جائے تو ان کی تلاش اور ترکیب میں محنت کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ مثلاً ہمارے ہاں "ٹیوب ویل" استعمال ہوتا ہے جس کا لفظی مطلب عوام بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ کیونکہ وہ ٹیوب اور ویل کے معنی نہیں جانتے لیکن اگر اس کی جگہ "نل کنواں" استعمال کرنے لگیں تو ایک جاہل بھی اس کے مفہوم ومعنی سے خود بخود آگاہ ہو جائے گا۔ مگر مغرب زدگی کی بدولت ایسے الفاظ ومرکبات استعمال کرنا کسرِ شان سمجھتے ہیں، جو سراسر احساس کمتری پر مبنی ہے۔ کم ازکم اب تو ایسا نہیں ہونا چاہیئے بلکہ زیادہ سے زیادہ قومی زبان کے الفاظ ومرکبات استعمال کرنے کا رجحان پیدا کرنا چاہیئے۔ اور جو ایسا کرتے ہیں ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے۔

ماهنامه

قومی زبان

کا

بابائے اردو نمبر

سنہ ۱۹۶۶ء

ڈاکٹر سید عبداللہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی میاں بشیر احمد خواجہ غلام السیدین رئیس احمد جعفری
ماہر القادری نزہت کاکوروی نواب مشتاق احمد خاں ڈاکٹر محشر عابدی ڈاکٹر احسن فاروقی
سید شبیر علی کاظمی ڈاکٹر وزیر آغا سید قدرت نقوی رئیس امروہوی
اور دیگر اہل قلم کے گرانقدر مضامین کا مجموعہ

"مرقع عبدالحق" کے نام سے بابائے اردو کی دو درجن سے زائد نادر و نایاب تصاویر شائع کی گئی ہیں۔

"بزم عبدالحق" کے عنوان سے بابائے اردو کے دوستوں اور نیاز مندوں کا تذکرہ

بابائے اردو کے متعدد غیر مطبوعہ خطوط

آفسٹ کی چھپائی عمدہ سفید کاغذ صفحات ساڑھے تین سو قیمت چھ روپے

انجمن ترقی اردو
بابائے اردو روڈ
کراچی

نئی کتابیں

PARALLEISM IN ENGLISH AND URDU POETS.

یہ اپنے موضوع پر پہلی اور نہایت دلچسپ کتاب ہے جس میں فاضل مرتب نے اردو اور یورپین شعراء کے ہم معنی اشعار کو یکجا کر دیا ہے۔ اس میں یہ التزام رکھا گیا ہے کہ عہد جدید کے کسی شاعر کے کلام سے (بہ استثنائے چند) مثالیں پیش نہیں کی گئیں بلکہ ایسے دور کے شعراء لئے گئے ہیں جن کے بارے میں یہ گمان بھی نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے ایک دوسرے کا نام سنا ہو یا وہ ایک دوسرے کی زبان سے بھی واقف ہوں۔ میر و سودا اور درد وغیرہ کے اشعار کے مقابل شیلے، کیٹس اور لانگ فیلو وغیرہ کے اقتباسات دیئے گئے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ ایک دوسرے کا ترجمہ ہوں۔

فاضل مرتب نے بڑی دیدہ ریزی اور کاوش سے ہم معنی اشعار کا یہ سفینہ مرتب کرتا ہے جو اس امر کا ثبوت ہے کہ مرتب اردو اور انگریزی دونوں زبانوں سے پوری طرح واقف ہے اور اس کا ان زبانوں کے ادبیات کا مطالعہ وسیع ہی نہیں گہرا بھی ہے۔ اس کتاب کے مرتب جناب ایس اے مہدی لکھنؤ اور علی گڑھ کے تعلیم یافتہ ہیں اور آج کل ممباسہ (کینیا) میں مقیم ہیں۔ اپنے وطن سے اتنی دور بیٹھ کر بھی اپنی زبان کی خدمت سے وہ غافل نہیں ہوئے۔ یہ کتاب مرتب کر کے انہوں نے ایک اہم ادبی خدمت انجام دی ہے۔ بقول پروفیسر سید احتشام حسین "یہ ایک لحاظ سے بنیادی کام ہے.... اس کو پیش نظر رکھ کر کوئی نقاد شاعروں کے عمل تخلیق کی نفسیاتی گتھیوں کو سلجھا سکتا ہے اور اس طرح کی یکسانیت اور مماثلت کے اسباب تلاش کر سکتا ہے":

یہ کتاب مرتب نے خود شائع کی ہے اور انہیں سے مل سکتی ہے۔ پتہ یہ ہے پوسٹ بکس ۵۰۳۔ ممباسہ کینیا۔ (ایسٹ افریقہ)

ترجمان القرآن:

سید سلیمان ندوی مرحوم نے لکھا ہے کہ "نوجوان مسلمانوں میں قرآن پاک کا ذوق ابوالکلام کے الہلال اور البلاغ نے پیدا کیا۔ اور جس اسلوب بلاغت، کمال انشاپردازی اور زور تحریر کے ساتھ انہوں نے انگریزی خواں نوجوانوں کے سامنے قرآن پاک کی ہر آیت کو پیش کیا اس نے ان پر ایمان و یقین کے نئے نئے دروازے کھول

دیئے اور ان کے دلوں میں قرآن پاک کے معنی و مطالب کی بلندی اور وسعت کو پوری طرح نمایاں کر دیا۔ سید صاحب مرحوم نے اس "مبارک وقت" کی حسرت کی تھی کہ "اس موثر قلم سے قرآن پاک کی پوری تفسیر شائع ہوتا کہ عربی سے نابلد مسلمانوں کے لئے نور بینش اور افزائش بصیرت کا سر و سامان اردو میں بھی میسر آئے"۔ اور جب یہ تفسیر شائع ہوئی تو اس کی تفسیری حیثیت اور اس کے علمی معیار کی نسبت فرمایا تھا:۔

"اس میں سورہ فاتحہ کے ایک ایک لفظ کی ایسی دل نشین تشریح، اور بصیرت افزا تفسیر ہے کہ اس سے اس سورہ کے ام الکتاب (اصل قرآن) ہونے کا مسئلہ مشاہدۃً معلوم ہونے لگتا ہے۔ اور اسلام کے تمام جہات مسائل اور اصول دین پر ایک تبصرہ ہو جاتا ہے، خصوصاً قرآن پاک کے طرز استدلال، خالق کائنات کی ربوبیت و رحمت کے آثار و دلائل اتنی تفصیل سے لکھے ہیں کہ مصنف کی وسعت علم و نظر کی داد بے اختیار دینی پڑتی ہے، اور امام غزالی نے "الحکمۃ فی مخلوقات اللہ تعالیٰ" میں" اور ابن قیم نے "مفتاح دار السعادۃ" میں اس مبحث پر جو کچھ لکھا تھا۔ اس سے زیادہ بسط و تشریح اور مقتضیات زمانہ کی مطابقت سے "ترجمان القرآن" میں یہ بحث آگئی ہے۔ چنانچہ توحید اور دلائل توحید نیز تخلیق بالحق، الہدی، ور الدین کی مصنف نے جو قرآنی تشریحیں کی ہیں، وہ اگر ایک طرف نکتہ پرور ہیں، تو دوسری طرف ایمان پرور ہیں"۔

سید صاحب کی یہ رائے ترجمان القرآن کے "نقش اول" کی نسبت تھی۔

سید صاحب نے "ترجمان القرآن" کو "وقت کی اہم چیز" لکھا تھا اور اس ضرورت کا اظہار فرمایا تھا کہ "اس کو گھر گھر پھیلایا جائے اور نوجوانوں کو اس کے مطالعے کی ترغیب دی جائے اور ہر اسلامی دار المطالعہ میں اس کا ایک نسخہ منگوا کر رکھا جائے"۔ ایک قرن سے زیادہ مدت گزر چکی ہے جب سید صاحب نے اس کی اہمیت اور ضرورت کو محسوس کیا تھا۔ اس مدت میں ہماری اجتماعی زندگی میں خرابیوں کے سیلاب اور ترجمان القرآن پر مولانا کی نظر و فکر اور تبدیلیوں نے اس کی علمی حیثیت و اہمیت اور اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی ضرورت اس سے بہت زیادہ کر دی ہے جتنی کہ سید صاحب مرحوم نے محسوس کی تھی۔ ترجمان القرآن کا یہ ایڈیشن پچھلی دونوں اشاعتوں سے اس درجہ مختلف چیز ہے کہ جن حضرات کے پاس اس کے پہلے دونوں ایڈیشن ہوں وہ بھی اس نسخے سے بے نیاز نہیں رہ سکتے۔ ترجمان القرآن پہلے دو جلدوں میں شائع ہوا تھا لیکن اب جدید ترتیب کے مطابق یہ تین جلدوں میں تقسیم کیا گیا ہے، تیسری جلد میں سورہ نور کا ترجمہ بھی شامل ہوگا جو دستیاب ہو گیا ہے۔ زیر تبصرہ جلد، ترجمان القرآن کی پہلی جلد ہے اور صرف سورہ فاتحہ کی تفسیر پر مشتمل ہے۔

یہ کتاب بیک وقت ہند و پاکستان میں شائع ہوئی ہے۔ ہندوستان میں اسے ساہتیہ اکیڈمی دہلی نے ٹائپ میں شائع کیا ہے۔ پاکستانی ایڈیشن سندھ ساگر اکیڈمی نے آفسٹ کے ذریعہ شائع کیا ہے۔ دونوں ایڈیشنوں کی قیمت بالترتیب بائیس اور پندرہ روپے ہے۔

—————

گردوپیش

تصویر کا ایک رُخ

آہ اردو مغربی پاکستان اسمبلی نے حزب اختلاف کے لیڈر خواجہ محمد صفدر کی یہ تحریک کثرت رائے سے مسترد کر دی ہے کہ اردو کو ۱۹۶۸ء تک دفتری اور سرکاری زبان بنا دیا جائے خواجہ محمد صفدر نے اپنی تقریر میں یہ بھی ثابت کر دیا تھا کہ اب اردو کی علمی اور دفتری اصطلاحیں اتنی تعداد میں وضع کی جا چکی ہیں کہ ان سے سارا کام بخوبی لیا جا سکتا ہے لیکن نتیجہ اس کے علاوہ کچھ نہیں نکلا کہ ۱۹۷۲ء میں ایک کمیشن یہ فیصلہ کرے گا کہ اردو کو دفتری زبان قرار دیا جائے یا نہیں۔

بلا تبصرہ روزنامہ امروز لاہور کے ۱۳ مئی کے شمارے سے ایک خبر من وعن نقل کی جاتی ہے۔ "ایک طرف قومی زبان اردو کو ہر سطح پر ذریعہ تعلیم بنانے کے بلند بانگ دعوے کئے جا رہے ہیں۔ تو دوسری طرف پرائمری کی سطح پر انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنانے والے کنڈر گارٹن اسکولوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ پرائمری سطح پر انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی کوشش کے پردے میں یہ احساس کارفرما ہے کہ ملک میں ترقی کرنے کے لئے صرف انگریزی زبان ہی سب سے اہم ہے"

تصویر کا دوسرا رُخ

اردو کی ترقی کے لئے مرکزی حکومت نے ایک سرکاری اعلان میں ۲ جولائی کو کہا ہے کہ مرکزی حکومت موجود منصوبہ کے دوران اردو کی ترقی کے لئے ۲۵ لاکھ روپے صرف کرے گی۔ اس اسکیم میں سائنسی کتابوں بالخصوص بی۔ایس۔سی کے لئے درسی کتابوں کی تیاری بھی شامل ہے۔ اس مقصد کے لئے سات لاکھ روپے خرچ کئے جائیں گے۔ پاکستان اور عام معلومات پر اردو کی کتابوں پر چار لاکھ ۵۰ ہزار روپے خرچ کئے جائیں گے۔ اس کے علاوہ اردو مراکز مختلف علاقوں میں قائم ہوں گے۔ اور ان میں اردو شارٹ ہینڈ کی کلاسیں شروع ہوں گی۔

تہذیبی - تعلیمی اور علمی خبریں

اردو ادب پر روس میں کتابیں

گزشتہ چند برسوں میں سوویت یونین کے مشرقی زبانوں کے مترجمین نے اردو ادب کے بہت سے شہ پاروں کا روسی میں ترجمہ کیا اور روس کے عوام کو اردو ادب سے روشناس کرایا۔ ان مصنفین میں مرزا غالب، علامہ اقبال، میرامن، پریم چند اور کرشن چندر کے نام شامل ہیں۔ اردو ادب کے متعلق روس کے ادبی رسالوں میں مضامین بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔

اسپینی زبان میں کلام مجید کا ترجمہ

اسپین میں پاکستان کے مبلغ مولانا کرم الٰہی ظفر نے ۲۲ جون کو کراچی میں انکشاف کیا ہے کہ اسپینی زبان میں قرآن حکیم کا ایک جامع ترجمہ تیار ہو چکا ہے۔ اور اب اس کی اشاعت کا بندوبست کیا جا رہا ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ اسپین کے دارالحکومت میں ایک مسجد کی تعمیر پر بھی غور ہو رہا ہے مولانا نے ایک سوال کے جواب میں یہ انکشاف بھی کیا کہ حکومت اسپین نے حال میں ایک قانون منظور کیا ہے جس کے تحت اسپین میں ہر مذہب اور فرقے کو مکمل آزادی حاصل ہوگی۔

میکگل یونیورسٹی میں

میکگل یونیورسٹی کی طرف سے ابتدائی اردو کے لئے ایک کورس جاری کیا گیا ہے جس کا مقصد مسلمانان برصغیر کی معاشرت، زبان اور تہذیبی زندگی کا مطالعہ پیش کرنا ہے۔ یہ کورس اردو پر عربی اور فارسی کے اثرات کی نشان دہی بھی کرے گا۔ میکگل یونیورسٹی ایک اخباری ریڈر اور ایک اردو شاعری کی ریڈر بھی تیار کرا رہی ہے۔ جس کے نگراں ڈاکٹر عبدالرحمان بارکر ہیں۔

مطبوعات کا منصوبہ

حیدرآباد کے اشاعتی ادارے "زاویہ مطبوعات" نے وادی مہران کے ادیبوں اور شاعروں کی حوصلہ افزائی اور اس علاقے میں اردو ادب کی اشاعت کا ایک جامع منصوبہ تیار کیا ہے۔ مہتمم زاویہ مطبوعات نے ادیبوں اور شاعروں سے اپنے مسودوں کی اشاعت کے لئے رابطہ قائم کرنے کی اپیل کی ہے۔

مجاز ایک آہنگ

مکتبۂ افکار کی جانب سے شائع کی جانے والی کتاب "مجاز ایک آہنگ" کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے۔ یہ کتاب مجاز کی زندگی، شاعری اور شخصیت پر ایک مبسوط تصنیف خیال کی جاتی ہے جس کا پیش لفظ بابائے اردو کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں نایاب تصویروں، خاکوں اور مضامین کے ساتھ مجاز کا غیر مطبوعہ کلام بھی شامل ہے۔ اس کتاب میں تمام مشہور اہل قلم نے حصہ لیا ہے۔

بچوں کے صدارتی انعامات

بچوں کے بہترین مضمون پر ہر سال جو صدارتی انعامات دیئے جاتے ہیں امسال اس کے لئے عنوان تجویز کیا گیا ہے "میں کس طرح ایک طالب علم

کی حیثیت سے ملک کی بہترین خدمت کرسکتا ہوں" یہ انعامات چھ ہیں - دو اردو دو بنگالی اور دو انگریزی کے لئے - اس کا اہتمام پاکستان کونسل برائے بہبودیٔ اطفال کر رہی ہے -

جمیل نقش کی تصاویر کی نمائش

۲۹ مئی کو گورنر اسٹیٹ بینک شجاعت علی حسنی نے جمیل نقش کی تصاویر کا افتتاح کیا - اس موقع پر ادیبوں، صحافیوں اور فنکاروں نے شرکت کی - جن میں جوش ملیح آبادی، رئیس امروہوی، پروفیسر احمد علی اور منصوری کے بہت سے پینٹر شامل ہیں۔

مخطوطات پیرس

ترقی اردو بورڈ لا ئبریری نے ببلیوتک نیشنال اور میوزے گیمے د پیرس کے اردو، سندھی اور پنجابی مخطوطات کی فہرست شائع کردی ہے - یہ فہرست جسے آغا افتخار حسین نے مرتب کیا ہے اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں ہے اور اس میں تقریباً پچاس مخطوطات پر تعارفی نوٹ لکھے گئے ہیں۔

آئینہ خانے میں

مادام بہنام کی تقریر

ایرانی کلچر سینٹر لاہور کی ڈائرکٹر مادام مریم بہنام نے کہا ہے کہ ایران اور پاکستان کی نئی نسل میں ملی شعور پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ علامہ اقبال کی تعلیمات کو دونوں ملکوں کے نصاب تعلیم میں زیادہ سے زیادہ شامل کیا جائے - وہ گورنمنٹ کالج برائے خواتین کے جشن تقسیم اسناد میں تقریر کررہی تھیں -

"باغی شاعر" کو خراج تحسین

ایسٹ پاکستان ایسوسی ایشن نے بنگالی کے آتش نوا اور باغی شاعر قاضی نذر الاسلام کی ۷۸ ویں سالگرہ بڑی دھوم دھام سے منائی - اس موقع پر اپنے ایک پیغام میں گورنر مغربی پاکستان جناب محمد موسیٰ نے کہا قاضی نذر الاسلام پہلا بنگالی شاعر ہے جس نے سنسکرت الفاظ کی جگہ عربی اور فارسی الفاظ اپنے اشعار میں استعمال کئے - اور اس طرح بنگالی کے ذخیرۂ الفاظ کو وسعت بخشی - اسلامی تہذیب کو فروغ دینے میں ان کے اس رحجان نے بہت زبردست خدمات انجام دیں -

یادوں کے چراغ

بیادِ اقبال

فلاٹ لیٹو کلب میں علامہ اقبال کی یاد میں ایک مجلس منعقد ہوئی - جس میں کئی دانشوروں نے پر مغز مقالے پڑھے - مقالات پڑھنے والوں میں ڈاکٹر امیر حسن صدیقی خواجہ عبدالوحید، بشیر احمد ڈار، ڈاکٹر انوار احمد صدیقی اور شمیم جاوید اہم ہیں۔

مولانا صلاح الدین کو خراج عقیدت

لاہور میں ۲ جون کو ایک جلسۂ عام میں اردو کے صاحب طرز ادیب اور بے باک صحافی مولانا صلاح الدین احمد کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا گیا اور متعدد مقررین کی جانب سے ان کی علمی، ادبی اور ملی خدمات کو شاندار خراج تحسین پیش کیا گیا۔ یہ جلسہ مرکز تعمیر نو میں موتمر عالم اسلامی کی صوبائی شاخ کی جانب سے منعقد ہوا تھا جس کی صدارت حکیم محمد حسن قریشی نے کی۔ جلسے سے آغا محمد باقر، مولانا حامد علی خاں، الطاف فاطمہ اور حکیم نیر واسطی نے خطاب کیا۔

شکاگو یونیورسٹی میں غالب

۱۹۶۹ء میں غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر امریکہ میں غالب کی یاد منانے اور ان کی تصانیف شائع کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنا دی گئی ہے۔ جس میں امریکہ کی مختلف یونیورسٹیوں کے وہ تمام اساتذہ شامل ہیں جن کو اردو ادب سے خاص شغف ہے۔ اس موقع پر پاکستان اور ہندوستان سے ایسے ادیبوں کو دعوت دی جائے گی جو غالب پر کام کر چکے ہیں اور ان کے لیکچرز کا اہتمام کیا جائے گا۔ ایک سیمینار ہوگا جس کا موضوع اردو ادب ہوگا اور اس کے لئے کئی تعلیمی اداروں کا تعاون حاصل کیا جائے گا اور ادیب اس میں اردو ادب پر اظہار رائے کریں گے۔ غالب کی بیس بہترین غزلوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا جائے گا جس میں ماہرین اردو امریکی شعرا کی مدد کریں گے۔ غالب پر شائع ہونے والے اعلیٰ مضامین کا انگریزی میں ترجمہ کیا جائے گا اور اسے انگریزی داں دنیا کے لئے شائع کیا جائے گا شکاگو سے شائع ہونے والا انگریزی ادبی رسالہ "محفل" اسی سال ایک غالب نمبر بھی شائع کرے گا۔

قابل اجمیری پر تحقیقی مقالہ

جامعہ سندھ کے ایم۔ اے فائنل اردو کے طالب علم جناب تسنیم جعفری نے جواں مرگ شاعر قابل اجمیری پر تحقیق مکمل کر لی ہے۔ انھوں نے ۲۵۰ صفحات پر مشتمل ایک مقالہ تحریر کیا ہے

حسرت موہانی اکادمی

۱۸ جون کو لیاقت آباد کراچی میں ایک جلسہ عام منعقد ہوا۔ جس میں کراچی کے نامور شعرائے کرام اور ممتاز ادیبوں نے شرکت کی۔ اور کثرت رائے سے حسرت موہانی اکادمی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ دنیا کی تمام کلاسیکی اور جدید زبانوں سے اردو زبان میں تراجم کے ذریعے اعلیٰ درجے کی علمی ادبی اور فنی کتب کی اشاعت کے منصوبے پر بھی اس جلسے میں غور کیا گیا۔

ظفر علی خاں اکادمی

لاہور میں وکلا، علما، صحافیوں اور دانشوروں کا ایک نمائندہ اجلاس ہوا۔ جس میں مولانا ظفر علی خاں کو پرجوش خراج تحسین پیش کیا گیا۔ اس اجلاس میں لاہور۔ لائل پور سرگودھا کے نمائندے بھی شامل تھے۔ اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ مولانا ظفر علی خاں کے نام پر ایک اکادمی کا قیام عمل میں

لایا جائے۔ اکادمی کے اغراض و مقاصد میں مولانا کے افکار و تعلیمات کا فروغ، ان کی تصانیف کی اشاعت اور ان کی قومی اور ملی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنا شامل ہے۔

نیاز فتحپوری کی پہلی برسی حلقہ نیاز و نگار کے زیر اہتمام سندھ مسلم کالج کے ہال میں علامہ نیاز کی پہلی برسی منعقد ہوئی جس کے مہمان خصوصی ممتاز حسن صاحب تھے۔ جن حضرات نے علامہ نیاز فتحپوری کو خراج تحسین پیش کیا ان میں جوش ملیح آبادی، ڈاکٹر محمود حسین، ڈاکٹر فرمان فتحپوری، ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی اور ممتاز حسن صاحب کے نام قابل ذکر ہیں۔

ماتم میں ہم شریک

مادر ملت کی وفاتِ حسرت آیات پاکستان کے لئے یہ سانحہ ایک زبردست رنج واندوہ کا سیلاب تھا۔ جب موت نے ان کے درمیان سے مادر ملت، خاتون پاکستان، ہمشیرۂ قائداعظم محترمہ فاطمہ جناح کو ہمیشہ کے لئے اٹھالیا۔ اس سانحہ پر پاکستان میں صف ماتم بچھ گئی۔ مادر ملت کی رحلت پر صدر مملکت سے لے کر ایک عامی تک سب کے جذبات ایک تھے کہ موت کے ظالم ہاتھوں نے پاکستان کی سب سے مقدس اور اصول پرست ہستی کو ہم سے چھین لیا۔ حکومت کے وزرا، عمّال، عوامی رہنماؤں، سیاسی جماعتوں، تعلیمی اداروں اور تہذیبی انجمنوں نے اس سانحہ کو پاکستان کے لئے زبردست نقصان بتایا ہے۔ ادیبوں اور شاعروں نے مادر ملت کی رحلت کو پورے ملک اور قوم کے لئے زبردست سانحہ قرار دیا ہے ادارہ قومی زبان اس قومی سانحے پر دلی افسوس کا اظہار کرتا ہے۔ سید قدرت نقوی نے مادر ملت کی وفات حسرت آیات پر جو قطعہ کہا ہے پیش کیا جاتا ہے۔

مادر ملت جناب فاطمہ — بہر ملک و قوم بودہ خادمہ
چوں شدم "افسردہ" گفتم بر وفات — رفت سوئے خلد اعلےٰ عالیہ

۳۵۰ + ۱۶۱۷ = ۱۹۶۷

شاہد احمد دہلوی کی رحلت اردو کے ممتاز ادیب صاحب طرز خاکہ نگار، مترجم، موسیقار اور مدیر جناب شاہد احمد دہلوی کے انتقال پر ملال پر مغربی پاکستان میں سخت رنج و افسوس کا اظہار کیا جارہا ہے۔ شاہد احمد دہلوی کا انتقال ۲۸ مئی کی شب کو ہوا تھا۔ کراچی میں کئی تعزیتی جلسے منعقد ہوئے۔ لاہور، پنڈی اور سندھ کے کئی شہروں میں ان کا سوگ منایا گیا۔

حضرت اثر لکھنوی کی وفات

اردو ادنیا میں یہ خبر دلی رنج واندوہ سے سنی گئی کہ مشہور صاحب طرز غزل گو اور بالغ نظر نقاد حضرت اثر لکھنوی ۱۳ جون کو کشمیری محلہ لکھنؤ میں وفات پاگئے ۔ اس خبر پہ تمام ادبی حلقوں میں صف ماتم بچھ گئی کیونکہ حضرت اثر کے ساتھ ایک پورے ادبی دور اور ایک عظیم روایت کا خاتمہ ہوگیا ۔ انتقال کے وقت مرحوم کی عمر ۹۲ سال تھی ۔ وہ خاصے عرصے تک بیمار رہے اور اچانک ان کی حالت بگڑ گئی ۔ حضرت اثر کشمیر کے تمام مقام وزیر اعظم بھی رہ چکے تھے ۔ اس سانحے پر اظہار افسوس کے لئے پاکستان اردو اکادمی کا ایک خصوصی اجلاس ہوا ۔ جس میں نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی کے انتقال پر اظہار تعزیت کے لئے ممتاز ادیب اور شاعر جمع ہوئے تعزیتی اجلاس کی صدارت ڈاکٹر شوکت سبزواری نے کی ۔ جناب جوش ملیح آبادی نے اثر لکھنوی کی ان خدمات کا ذکر کیا جو انھوں نے اردو شاعری کے سلسلے میں انجام دیں ۔ انھوں نے حضرت اثر کو ادب وتنقید کی مستند شخصیت قرار دیتے ہوئے کہا کہ ان کے انتقال سے اردو شاعری کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے ۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے حضرت اثر لکھنوی کی موت کو اردو ادب کا ناقابل تلافی نقصان قرار دیا اور کہا وہ عظیم محقق شاعر اور نقاد تھے ۔ ادارہ قومی زبان اردو ادب کے اس زبردست نقصان پر دلی رنج وافسوس کا اظہار کرتے ہوئے ان کے پسماندگان سے دلی ہمدردی کرتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ خدا مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے ۔

مولانا امین شرقپوری کی رحلت

مشہور صحافی اور صاحب قلم ادیب مولانا محمد امین شرقپوری کا انتقال لاہور میں ۲۹ جون کی دوپہر کو ہوگیا ہے ۔ مرحوم کئی ماہ سے بیمار تھے اور میو اسپتال میں زیر علاج تھے ۔ ان کی تجہیز وتکفین ان کے آبائی وطن شرقپور میں ہوئی ۔

طالب الہ آبادی کا انتقال

مشہور صحافی اور مضمون نگار جناب طالب الہ آبادی کا انتقال حرکت قلب بند ہوجانے کی وجہ سے کراچی میں ۵ جولائی کو ہوگیا ۔ مرحوم کو سوسائٹی میں دفن کردیا گیا ۔ آپ نے تقسیم سے قبل اور قیام پاکستان کے بعد پاک وہند کے ممتاز رسائل اور اخبارات میں مضامین لکھے تھے ۔ اکبر الہ آبادی پر آپ کی تالیف علمی وادبی حلقوں میں خاص شہرت رکھتی ہے ۔

آئینۂ ہند

یوپی میں زبان کے مسئلے پر اختلاف

زبان کے مسئلے پر اختلافات کی وجہ سے یوپی میں برسر اقتدار پارٹیوں میں پھوٹ پڑ رہی ہے جہاں تک وزیر اعلیٰ مسٹر چرن سنگھ کا تعلق ہے وہ اس بات کے حق میں ہیں کہ انگریزی ہندی اور ایک ہندوستانی زبان کا استعمال جاری رکھا جائے ۔ لیکن مخلوط حکومت کی سب سے بڑی پارٹی جن سنگھ صرف دو زبانیں چاہتی ہے ۔ لیکن یہ مسئلہ بجائے سلجھنے کے اور الجھا جا رہا ہے ۔

تحفظ اردو کے لئے

ہندوستانی اخبارات کی اطلاع کے مطابق لکھنؤ میں تحفظ اردو وفد نے احتجاج کے طور پر بھوک ہڑتال کردی ہے۔ وفد نے یوپی کی حکومت پر زور دیا ہے کہ وہ اردو کو اس کا صحیح مقام دلائے۔ یوپی کے ایک نائب وزیر جناب شمیم عالم نے بھی اس مطالبے کی حمایت کی ہے اور کہا ہے اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا معقول انتظام کیا جائے۔ یوپی کے نائب وزیر اعلیٰ جناب رام پرکاش نے وفد کو یقین دلایا ہے کہ ریاست میں اردو کو اس کا صحیح مقام دیا جائے گا۔

ڈاکٹر نارنگ کا علمی سفر

خبر ہے کہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ریڈر اردو، دہلی یونیورسٹی کو مستشرقین کی بین الاقوامی کانگرس میں شریک ہونے کی دعوت دی گئی ہے۔ کانگرس کا اجلاس اگست میں مشی گن یونیورسٹی، امریکہ میں ہوگا۔ ڈاکٹر نارنگ اس کے ایشیائی ادب کے شعبے میں اردو ادب کے جدید رجحانات پر مقالہ پڑھیں گے۔ وہاں سے وہ وسکانسن، واشنگٹن اور نیویارک جائیں گے اور ستمبر کے آخر تک ہندوستان لوٹ آئیں گے۔ واپسی پر وہ چند ہفتوں کے لئے یورپ میں رکیں گے اور اردو مثنویوں پر اپنی کتاب کے دوسرے اڈیشن کے لئے لندن اور پیرس کے کتب خانوں سے نادر مواد جمع کریں گے۔

عابد رضا بیدار

اختر شہنشاہی

اِشاریہ

(۴)

۴۲۹ سحرِ بابل[ل] ۔ فتحپور، ماہواری، ۱۲ ورق خورد، شعر و سخن کا گلدستہ .....، مالک نظام الدین شوقی ...، یکم ستمبر ۱۸۸۶ء

۴۳۰ سرپنچ ہند۔ لکھنؤ...، ہفتہ وار، ۴ ورق اوسط...، مالک امبکا پرشاد...، مہتمم عبدالغنی...، یکم ستمبر ۱۸۷۷ء

۴۳۱ سرپنچ۔ سید پور، ضلع غازی پور، ہفتہ وار، ۴ ورق خورد...، مالک شیو پرشاد... مہتمم محمد لطیف شفق۔ پہلے اس کا نام تمرۂ مستانہ۔ ضمیمۂ آئینۂ تہذیب تھا... ۱۰ ستمبر ۱۸۸۲ء

۴۳۲ سرپنچ بمبئی ... مہینہ میں دو بار، ۲ ورق اوسط...، مہتمم سید محمد عربی، ایڈیٹر ابوالحسن جوہر بریلوی۔ مہتمم اخبار ارمغان...، ۱۵ مئی ۱۸۸۳ء

۴۳۳ سرپنچ میرٹھ، ہفتہ وار، ۲ ورق کلاں... مالک رفیع الدین، ہمشیرہ زادۂ سید جمیل الدین ہجر مرحوم مالک اخبار لارنس گزٹ... اس کا دوسرا نام قیصرِ ہند ہے .....، ۱۸۸۶ء

۴۳۴ سراج الاخبار۔ جہلم ...، ہفتہ وار، ۴ ورق اوسط...، مالک فقیر محمد خاں... یکم جنوری ۱۸۸۵ء

۴۳۵ سرورِ قیصری: پہلے یہ اخبار رام پور ضلع مراد آباد، ہفتہ وار، ۶ ورق اوسط پر... حکیم احمد رضا نے شائع کیا۔ اب جنوری ۱۸۸۸ء سے مطبع حیدری محلہ کٹرہ جلال الدین خان باہتمام حکیم حیدر علی خاں کے اشاعت پاتا ہے...، یکم مئی ۱۸۸۴ء

۴۳۶ سرورِ قیصری: کھیر ضلع علی گڑھ، پندرہ روزہ، ۴ ورق ...، مالک جھمنی لال ...، اشتہار یکم ستمبر ۱۸۸۷ء بوعدہ اجرائے اخبار یکم جنوری ۱۸۸۸ء

۴۳۷ سروشِ بنارس: بنارس ...، ہفتہ وار، ۴ ورق اوسط...، مالک شیخ ولی محمد شفا اثنا عشری...، ۲۰ ستمبر ۱۸۸۵ء

۴۳۸ سرمایۂ فراست: بھوپال، ماہواری ... سید اکرام الدین، مہتمم رسالہ... یکم اکتوبر ۱۸۸۵ء

۴۳۹ سری گورمت پرکاشک: یہ رسالہ قومی گو سکھ سنگھ سبھا، راولپنڈی، ماہواری، ۱۴ ورق خورد، مشترک حروف گورمکھی و زبان گورمکھی، حرف اردو...، مہتمم بھائی اوتار سنگھ... اجرائے نانک شاہی ۱۸۱۶ء

[ل] قسط نمبر ۳ میں شمار کی غلطی کی وجہ سے اخبارات کی تعداد میں تین کا اضافہ ہو گیا تھا لہٰذا موجودہ قسط کو ۴۳۲ کی بجائے ۴۲۹ سے شروع کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

خالصہ سمت ۱۸۶ بکرم سمت ۱۹۴۳ اجرائے مئی ۱۸۸۶ء

۴۴۰ **سرمور گزٹ** ۔ ناہن براہ انبالہ، ہفتہ وار ...، یکم مئی ۱۸۸۸ء

۴۴۱ **سرمۂ روزگار** ۔ آگرہ ... ہفتہ وار ... ۴ ورق اوسط ...، مالک سید عشرت حسین ...، یکم اگست ۱۸۸۷ء

۴۴۲ **سفیر آگرہ** ۔ آگرہ، ہفتہ وار، ۶ ورق ... اجرائے اشتہار ۱۹ جنوری ۱۸۵۶ء

۴۴۳ **سفیر مدراس** ۔ مدراس ... عشرہ وار، ۴ ورق کلاں ... مالک میر قاسم علی ...، اکتوبر ۱۸۷۴ء

۴۴۴ **سفیر صفیر** ۔ آرہ، ضلع شاہ آباد، قسمت پٹنہ، محلہ پھاٹک سادات بلگرام، شعر و سخن کا ہفتہ وار، ۴ ورق خورد کا گلدستہ، ضمیمۂ ضیاء الابصار، مالک سید فرزند احمد صفیر بلگرامی اثنا عشری، مہتمم سید خورشید احمد اثنا عشری ... ۱۸۷۴ء

۴۴۵ **سفیر ہند** ۔ دہلی ... پندرہ روزہ، ۴ ورق اوسط ... مہتمم بولاقی داس ...، جنوری ۱۸۷۴ء

۴۴۶ **سفیر ہند** ۔ امرتسر، ہفتہ وار، ۸ ورق اوسط ...، مالک پادری رجب علی ...، یکم جنوری ۱۸۷۸ء

۴۴۷ **سفیر بڈھانہ** ۔ قصبہ بڈھانہ ضلع مظفر نگر، ہفتہ وار، ۲ ورق کلاں ...، مالک راؤ امر سنگھ ...، یکم جنوری ۱۸۷۶ء

۴۴۸ **سفیر پنجاب** ۔ بجوارہ ضلع ہوشیار پور، ہفتہ وار، ۲ ورق کلاں ... مالک سندھی خاں منتقی ... یکم جون ۱۸۸۴ء

۴۴۹ **سفیر گورنمنٹ** ۔ انار کلی، ضلع لاہور، ہفتہ وار، ۸ ورق اوسط ...، دوسرا نام ناظم ہند ...، مالک سید ناظر حسین ناظم ...، اشتہار یکم جولائی ۱۸۸۵ء

۴۵۰ **سفیر عام** : بھوپال، ہفتہ وار، ۴ ورق اوسط ...، مہتمم عبدالواحد ...، یکم ستمبر ۱۸۸۵ء

۴۵۱ **سفیر ٹونک** ۔ ٹونک، ہفتہ وار، ۴ ورق کلاں ... مالک غالب علی خاں ... ۳، جنوری ۱۸۸۷ء

۴۵۲ **سفیر دکن** ۔ حیدر آباد دکن، ایڈیٹر نثار علی شہرت ...، ۱۸۸۸ء

۴۵۳ **سکھ دایک سبھا** ۔ یہ رسالہ قومی سود برادری بہروپیاں، ۲۰ ورق خورد ... سکرتری ہری چند ساہنی، یکم جنوری ۱۸۸۳ء

۴۵۴ **سلطان الاخبار** ۔ کلکتہ ... ہفتہ میں دوبار ... زبان فارسی ...، مالک محمد طاہر، مہتمم سید جناب علی، ایڈیٹر نور اللہ، اجرا یکم جنوری ۱۸۳۷ء

۴۵۵ **سلطان الاخبار** ۔ یہ اخبار ہفتہ وار، ۴ ورق کلاں ... پر یکم جنوری ۱۸۸۰ء کو جاری ہوا بنام نامی قیصر روم سلطان عبدالحمید خان پادشاہ غازی ...، مہتمم سید قادر بادشاہ قادری

۴۵۶ **سلطان الظرفا** : لکھنؤ ... ہفتہ وار، ۴ ورق اوسط ...، مہتمم ڈاکٹر اسحٰق حسن خاں ... دوسرا نام مسٹر پنچ ...، ۴ جنوری ۱۸۸۳ء

۴۵۷ **سلام** ۔ درگاہ نظام الدین، ضلع دہلی ... شعر و سخن کا ماہواری، ۸ ورق خورد گلدستہ ... مالک امیر سنگھ اجرائے ۴ جنوری ۱۸۸۴ء

۴۵۸ **سمی ہنود** نینی تال، پندرہ روزہ، ناگری مشترک، ۸ ورق اوسط ... یکم جنوری ۱۸۷۳ء

۴۵۹ **سوانح عمری** ۔ لاہور ... ۱۸ ورق خورد کا ماہوار رسالہ ۔ جس میں ہر ملک اور قوم کے مذہبی سوشیل اور پولیٹکل ریفارمر اور نیز دیگر بڑے بڑے مہاتما اور بزرگوں کی سوانح عمری سلسلہ وار درج ہوتی ہے۔ اجرا یکم اپریل ۱۸۸۲ء

۴۶۰ **سیدالاخبار** ۔ دہلی ... مکان مفتی صدرالدین مرحوم ۔ ہفتہ وار، ۲۰ ورق کلاں ۔ پہلے کالم میں انگریزی دوسرے کالم میں اردو تیسرے کالم میں ناگری ... مالک مراری لال ۔ مہتمم شیخ وزیر علی ... ۱۸۷۲ء

۴۶۱ **سیف گورنمنٹ** ۔ لاہور ... پندرہ روزہ ... مالک سید نادر علی شاہ سیفی، مہتمم بیر سنگھ ... اشتہار ۱۵ جنوری ۱۸۸۵ء

۴۶۲ **سیف الاسلام** ۔ بمبئی ... ہفتہ وار، ۲۰ ورق کلاں ... ۱۸۷۶ء

۴۶۳ **سعیدالاخبار** ۔ بدایوں، محلہ کھیڑہ بزرگ بحکم چودہری سعیدالدین حسین صاحب رئیس، ماہواری، ۶ ورق ... مالک فضل علی ... اشتہار یکم جنوری ۱۸۸۵ء

۴۶۴ **سوال جواب قانونی شیام لال** ۔ کانپور ... مجاریہ شیام لال وکیل ... مالک بدری پرشاد ... نومبر ۱۸۸۳ء

۴۶۵ **سہیل** ۔ بنارس ... ہفتہ وار، ۶ ورق اوسط ... مہتمم شرف الدین احمد ۔ یکم جنوری ۱۸۸۶ء

۴۶۶ **شمس الاخبار** ۔ لکھنؤ ... ۸ ورق اوسط، پندرہ روزہ ... مالک پادری مسمور، مہتمم پادری کریون ... اخبار عیسائیوں کا ہے ۸ برس بعد ... نام کوکب ہند ۱۸۷۶ء

۴۶۷ **شام اودھ** ۔ فیض آباد، ۴ ورق اوسط، پندرہ روزہ ... مالک شیو پرشاد ۔ ایڈیٹر کشن پرشاد ... ۱۸۸۴ء

۴۶۸ **شام وصال** ۔ یہ اخبار ضمیمہ ہے ۔ ہفتہ وار، اخبار شفیق ہند کا جو چھوٹے دو ورقوں پر ہے، ہر روز شام کو طبع ہوکر اشاعت پاتا ہے ... مالک مہر بخش ... یکم اکتوبر ۱۸۸۴ء

۴۶۹ **شرف الاخبار** ۔ بہار شریف، ضلع پٹنہ ... ہفتہ وار، ۴ ورق اوسط ... مہتمم شاہ مقبول حسین ... ۴ جنوری ۱۸۸۳ء

۴۷۰ **سررشتہ تعلیم اودھ** ۔ ماہواری، ۸ ورق اوسط ... ایڈیٹر و مہتمم سید ابوالحسن ... یکم جنوری ۱۸۶۸ء

۴۷۱ **شحنۂ ہند** ۔ میرٹھ ... ہفتہ وار ... ۴ ورق اوسط ... مالک احمد حسن شوکت ... ۲۰ جنوری ۱۸۸۳ء

۴۷۲ **شمس الاخبار** ۔ مدراس ... ہفتہ وار، ۴ ورق ... مالک نصیرالدین گھالہ آفندی ... ۱۸۵۹ء

۴۷۳ **شمس العلوم** ۔ احمد آباد کا رسالہ ماہواری، ستمبر ۱۸۸۶ء

۴۷۴ **شوکت اسلام** ۔ پہلے ... چھوٹے چار ورقوں پر ... پونہ سے، بتاریخ ۴ جولائی ۱۸۸۲ء کو جاری ہوا۔ پھر بمبئی میں شائع ہوتا رہا ... ہفتہ وار، ۴ ورق کلاں ... مقام حیدرآباد دکن، مہتمم ابوالقاسم اظہرالدین، مالک حاجی محمد قاسم۔

۴۷۵ **شوکت ہند** ۔ بمبئی ... ہفتہ وار، ۴ ورق کلاں ... مالک راحت علی ... یکم دسمبر ۱۸۸۵ء

۴۷۶ **شگوفہ** ۔ حیدرآباد ... شعر و سخن کا ماہواری گلدستہ، ۱۹ ورق خورد ... مالک سید احمد زید بلگرامی ... ۱۵ر نومبر ۱۸۸۳ء

۴۷۷ **شعلۂ طور** ۔ کانپور ... ہفتہ وار، ۸ ورق اوسط ... مالک جگناپرشاد، ایڈیٹر حیدر علی ... ۱۸۶۰ء

۴۷۸ **شفاء الصدور** ۔ لاہور، ماہواری، ۵ ورق اوسط ... زبان عربی، مولوی فیض الحسن سہارنپوری ... ۱۸۷۵ء

۴۷۹ **شفق** ۔ حیدرآباد، ہفتہ وار، ۳ ورق کلاں ... مالک سید حسین رضوی ... ۱۸۸۱ء

۴۸۰ **شفیق ہند** ۔ لاہور ... ہفتہ میں ایک مرتبہ ... ۲ ورق اوسط ... مالک مہر بخش، مہتمم سیف الحق ادیب دہلوی ... ۱۸۸۴ء

۴۸۱ **شمیم** ۔ الہ آباد ... ہفتہ، ۴ ورق خورد، رائے کشوری لال مالک اخبار ... یکم جنوری ۱۸۸۲ء

۴۸۲ **شمع سخن** ۔ بنگلور، ماہواری، ۸ ورق خورد شعر و سخن کا گلدستہ ... مالک مولانا عبدالحق تحقیق ... ۳۰ر اپریل ۱۸۸۴ء

۴۸۳ **شوخ اودھ** ۔ لکھنو، ہفتہ وار، ۲ ورق اوسط ... مالک سید تصور حسین ... ۲۳ر مئی ۱۸۸۲ء

۴۸۴ **شمشاد ہند** ۔ بنارس ... عشرہ وار، ۲ ورق خورد ... مالک حکیم کریم الدین حسن ... ۱۸۸۲ء

۴۸۵ **شریر** ۔ لاہور ... ۲ ورق خورد، پندرہ روزہ، ضمیمہ خادم ہند ... مالک اوتم چند کپور ... ۲۴ر جون ۱۸۸۷ء

۴۸۶ **شور عنادل** ۔ علی گڑھ، ماہواری، ۸ ورق خورد، شعر و سخن کا گلدستہ، مالک بنواری لال وکیل ... ۱۸۸۷ء

۴۸۷ **شیخ چلی** ۔ سیالکوٹ ... ہفتہ وار، ۴ ورق خورد ... مالک مان سنگھ اہلووالیہ ... اشتہار ۶ر اکتوبر ۱۸۸۵ء

۴۸۸ **صادق الاخبار** ۔ دہلی ۔ مالک سید محمد صادق مرحوم ۱۸۵۸ء [26]

۴۸۹ **صادق الاخبار** ۔ بہاولپور، ہفتہ وار، ۸ ورق اوسط ۔ مہتمم پنڈت دوارکا ناتھ، ایڈیٹر محمد اشرف برقی ... ۱۸۶۷ء

۴۹۰ **صبح بنارس** ۔ بنارس، ہفتہ وار، ۲ ورق اوسط ... مالک بھوت ناتھ ایڈیٹر مرزا محمد حسین فائز اشتہار عشری ... ۱۶ر جون ۱۸۷۹ء

۴۹۱ **صبح وطن** ۔ پٹنہ ... ہفتہ وار، ۲ ورق خورد ... مالک حسن علی، ایڈیٹر سید رحیم الدین ... یکم جون ۱۸۸۱ء

۴۹۲ **صحیفۂ قدسی** ۔ دہلی ... ہفتہ وار ... مالک و ایڈیٹر مولانا عبدالقدوس قدسی ... ۸ ورق اوسط ... یکم مارچ ۱۸۸۵ء

۴۹۳ **صحیفۂ نامی** ۔ لکھنو، مہینہ میں دوبار ... ۲ ورق اوسط، مالک ابوالحسنات حافظ خواجہ قطب الدین احمد ... ایڈیٹر خواجہ احمد حسن ... یکم اکتوبر ۱۸۸۶ء

۴۹۴ **صدر پنچ** ۔ دہلی، ہفتہ وار، ۳ ورق خورد ... یکم فروری ۱۸۸۷ء

۴۹۵ **صدق** ۔ بہار شریف ... ضلع پٹنہ ... مہینہ میں دوبار ... ۲ ورق اوسط ... مالک عبدالقادر فردوس ... اب اس کا نام بو قلموں صدق ہوگیا ... ۱۴ر جولائی ۱۸۸۵ء

۴۹۶ **ضیاء الاخبار** ۔ دہلی ... مکان منشی ذکاء اللہ خان بہادر پروفیسر، عشرہ وار، ۴ ورق اوسط ... مالک مرتضیٰ خاں دردی

.... ایڈیٹر حاجی عزیزالدین نظیر ۱۸۶۶ء

۴۹۷ **ضیاء الابصار** ۔ آرہ، ضلع شاہ آباد.. ہفتہ دار، ۴ ورق خورد... مالک سید محمد ہاشم بلگرامی، ایڈیٹر سید فرزند احمد بلگرامی اثنا عشری ... ۱۸۷۳ء

۴۹۸ **ضیاء الاسلام** ۔ دہلی ... عشرہ دار، ۴ ورق اوسط.. مالک سید میر حسن رضوی، ایڈیٹر شاہزادہ مرزا عبدالغنی... ۱۸۷۷ء

۵۹۹ **طلسم لکھنؤ** ۔ لکھنؤ... ہفتہ دار، ۴ ورق ... مالک محمد یعقوب انصاری... ۱۸۸۵۷ء

۵۰۰ **طلسم حیرت، مدراس پنچ** ۔ مدراس .... عشرہ دار، ۴ ورق اوسط ... مالک شاہ محمد صدیق شریف ..... ایڈیٹر غلام محی الدین حلیف ... ۱۸۵۹ء

۵۰۱ **طلسم کرتان** ۔ بنگلور، ہفتہ وار، ۶ ورق اوسط ... ۱۸۶۵ء

۵۰۲ **طوطی ہند** ۔ میرٹھ، ہفتہ دار، ۶ ورق اوسط.... اس اخبار کو سید محمد مرتضیٰ بیان ویزدانی نے ۱۸۸۱ء کو جاری کیا ایڈیٹر سید کرار حسین روحانی ۔ اب باہتمام سید سجاد حسین ریحانی مالک اخبار و رئیس شہر۔

۵۰۳ **طبّ حیوانات** ، لاہور ... ماہواری، ۱۲ ورق خورد ... ایڈیٹر مہتمم ڈاکٹر محمد دین... یکم جولائی ۸۴ء

۵۰۴ **طبیب لاہور** ۔ لاہور، ۱۰ ورق خورد، ماہواری، ۳۰ر جنوری ۱۸۸۵ء سے شائع ہوتا ہے ۔. مالک و ایڈیٹر حکیم فخرالدین ....

۵۰۵ **طغرائے اعجاز** ۔ مطبع احمدی .. پندرہ روزہ، ۴ ورق خورد، شعر و سخن کا گلدستہ ... ایڈیٹر و مہتمم عبدالجلیل نعمانی ... یکم جولائی ۱۸۸۵ء

۵۰۶ **طوفان** ، ضمیمہ شیخ چلی ۔ سیالکوٹ ... ہفتہ دار، مالک مان سنگھ اہلوالیہ، اشتہار یکم جنوری ۱۸۸۶ء

۵۰۷ **ظہیر الاسلام** ۔ مدراس .... ۸ ورق خورد، پندرہ روزہ رسالہ ... مہتمم سید محمد مرتضیٰ شاہ قادری ۔ ۵ اپریل ۱۸۸۶ء

۵۰۸ **ظریف** ۔ بنارس ... مالک سدہ گوپال، مہتمم اچھا پرشاد... ایڈیٹر اشرف علی ... ۲۹ر ستمبر ۱۸۸۲ء

۵۰۹ **ظریف ہند** ۔ دہلی ... ہفتہ دار، ۴ ورق اوسط.. مالک و ایڈیٹر افضل خاں دہلوی پارسا... یکم مارچ ۱۸۸۵ء

۵۱۰ **ظریف الہند** ۔ میرٹھ... ہفتہ دار، ۴ ورق خورد... مالک ثابت علی، مہتمم وزیر علی ۔ ایڈیٹر حسین علی فرصت دہلوی... یکم جنوری ۱۸۸۶ء

۵۱۱ **ظرافت** ۔ دہلی ... ماہواری، ۲ ورق خورد .... مالک بلاقی داس، منصرم ذاکر بیگ... یکم جنوری ۱۸۸۶ء

۵۱۲ **عروج محمدی** ۔ الہ آباد.. ہفتہ دار، ۴ ورق اوسط.. مالک ارشاد حسین خاں، مہتمم راحت حسین خاں ۔ ۲ر ستمبر ۱۸۸۲ء

۵۱۳ **عزیز الاخبار** ، محمد پور، ارکاٹ ۔ مدراس ... ہفتہ دار، ۴ ورق اوسط.. مالک شاہ عزیز الدین گھٹالہ، مہتمم محمد مرتضیٰ گھٹالہ ... ایڈیٹر سید حسین... یکم جولائی ۱۸۸۶ء

۵۱۴ عِطرِ فتنہ ۔ ضمیمہ فتنہ گورکھپور، ہفتہ وار، ۲ ورق خورد۔۔ مالک ریاض الدولہ بہار الملک منشی سید ریاض احمد ریاض۔ مہتمم حافظ نظام احمد انداز خیر آبادی ۔۔۔ یکم جنوری ۱۸۸۵ء

۵۱۵ عَطّار ۔ کانپور، ماہواری ۲۰۰ ورق خورد، طب کا رسالہ۔۔ مالک عوض بخش ڈاکٹر، مہتمم عبدالغنی ۔۔۔ یکم جنوری ۱۸۸۶ء

۵۱۶ عَطَارد ۔ قنوج۔ ضلع فرخ آباد ۔۔۔ ۴ ورق خورد، ماہواری ۔۔ مجاریہ بال کرشن، مہتمم میر سید حسین۔ ایڈیٹر سالک رام انور لکھنوی، اکتوبر ۱۸۸۵ء

۵۱۷ عَالمِ تصویر ۔ کانپور، ۶ ورق اوسط ۔۔ جنوری ۱۸۸۷ء سے ہفتہ وار، مالک رحمت اللہ آلہ۔ یکم جنوری ۱۸۸۶ء

۵۱۸ عمدۃ الاخبار ۔ بھوپال، ہفتہ وار ۶ ورق اوسط ۔۔ مالک حکیم اشرف حسین، مہتمم عبدالمجید خاں ۱۸۷۷ء

۵۱۹ عمدۃ الاخبار ۔ فتح گڑھ ضلع فرخ آباد۔۔ ہفتہ وار ۔۔ ۶ ورق اوسط ۔۔ مالک حکیم اصغر حسین۔ یکم جنوری ۱۸۷۷ء

۵۲۰ علیم الاخبار ۔ کلکتہ۔ ہفتہ وار ۶ ورق۔ مالک علیم الدین احمد، مہتمم اسمٰعیل خان شوکت ایڈیٹر واعظ الدین احمد، ۲۰ جولائی ۱۸۸۵ء

۵۲۱ عندلیبِ ہند ۔ بمبئی ۔۔۔ ہفتہ وار ۔۔۔ ۶ ورق اوسط، مالک اندر سروپ مہتمم کشن سروپ ۸ ستمبر ۱۸۸۰ء

۵۲۲ غالب الاخبار ۔ سیتاپور، ہفتہ وار، ۸ ورق اوسط ۔۔۔ مجاریہ شاہ سید محمد صادق و آغا عبدالغنی ۔۔۔ مرزا محمد قاسم ۔۔۔ یکم مارچ ۱۸۶۹ء

۵۲۳ غنچۂ مراد ۔ شملہ، ماہواری خورد۔ شعر و سخن کا گلدستہ ۔۔ مالک و ایڈیٹر، عبدالقادر تائب ۔۔ ۱۵ اپریل ۱۸۸۶ء

۵۲۴ غم خوارِ ہند ۔ لاہور ۔۔۔ ہفتہ وار، ۶ ورق اوسط ۔۔ یکم فروری ۱۸۸۵ء کو شائع ہوا ۔۔۔ مالک پنڈت مہاراج کشن غمخوار ۔۔۔ ۷ جنوری ۱۸۸۵ء

۵۲۵ فارسی اخبار ۔ یہ اخبار سلیس اور عام فہم فارسی میں ۔۔۔ لاہور سے ۴ ورق خورد، ہفتہ وار ۔۔ باہتمام شمس الدین شائق کے شائع ہوا ۔۔۔ اب گورداس پور سے نکلتا ہے ۔۔ یکم اپریل ۱۸۸۴ء

۵۲۶ فتنہ ۔ گورکھپور ۔۔۔ ہفتہ وار ۸ ورق خورد ۔۔ مجاریہ ریاض الدولہ بہار الملک۔ سید ریاض احمد ریاض رئیس خیر آباد، مہتمم حافظ نظام احمد انداز رئیس خیر آباد ۔۔ جولائی ۱۸۸۲ء

۵۲۷ فتح گڑھ پنچ ۔ فرخ آباد ۔۔۔ مہینہ میں دو بار، ۶ ورق اوسط ۔۔۔ مالک ذوقی رام، ایڈیٹر صدیق منت ۔۔۔ ۱۵ اگست ۱۸۸۵ء

۵۲۸ فرحت الاحباب ۔ بمبئی ۔۔۔ ہفتہ وار ۔۔۔ ۲ ورق اوسط ۔۔۔ مالک محمد منظور ۔۔ ۱۸۷۶ء

۵۲۹ فروغ ۔ بنارس ۔۔۔ ہفتہ وار، ۴ ورق اوسط ۔۔ مالک سید محمد سلطان اثنا عشری، عاقل دہلوی ۔۔۔ یکم جولائی ۱۸۸۰ء

۵۳۰ **فـرّخ** ۔ رام پور... ضلع مرادآباد۔ ماہواری، ۱۸ ورق خورد... بسرپرستی شیخ فضل احمد فرخ مہتمم گلدستہ حکیم محمد رضا، مالک حکیم احمد رضا... یکم ستمبر ۱۸۸۵ء

۵۳۱ **فتح الاخبار** ۔ کول مقام باغ، ہفتہ وار، ۴ ورق اوسط...، مالک عثمان خان، مہتمم کرپاشنکر سکندرآبادی۔

۵۳۲ **فصیح الاخبار** ۔ الہ آباد..، ہفتہ وار، ۴ ورق اوسط... مالک فصیح اللہ... یکم جنوری ۱۸۸۶ء

۵۳۳ **فلاسفر** ۔ آگرہ...، مہتمم کرامت علی کرآلی...، ماہواری، ۶ ورق خورد... یکم جولائی ۱۸۸۵ء، سے...، اس کی قیمت معاف ہے...، ۱۵ر جنوری ۱۸۸۵ء

۵۳۴ **فنون** ۔ زراعت و تجارت و حرفت و صنعت کو ترقی دینے کے واسطے یہ ماہواری رسالہ، ۲۰ ورق خورد... مشتاق احمد حقی نے یکم جولائی ۱۸۸۳ء ...اب...، باہتمام جونس ایڈیٹر شائع ہوتا ہے۔ ..... حیدرآباد، دکن۔

۵۳۵ **فہرست عہدہ داران ممالک مغربی و شمالی واودھ** :۔ الہ آباد، سہ ماہی، ۳۰ ورق خورد...، مہتمم جی بلان چیٹ...، ۳۱ر مارچ ۱۸۷۹ء

۵۳۶ **فہرست عہدہ داران پنجاب** :۔ لاہور، سہ ماہی، ۳۶ ورق... مالک و مہتمم سید نادر علی شاہ سیفی... ۱۸۸۰ء

۵۳۷ **فیضِ عام** ۔ امرتسر...، ہفتہ وار، ۴ ورق خورد...، مالک گنداارام... یکم مارچ ۱۸۸۷ء

۵۳۸ **فیض سخن لکھنؤ** ۔ ماہواری ۱۲ ورق خورد شعر و سخن کا گلدستہ... مالک مرزا عباس حسین ہوش ۲۴ر مئی ۱۸۸۳ء

۵۳۹ **فیض سخن دہلی** ۔ ماہواری شعر و سخن کا گلدستہ...، ۱۰ر جون ۱۸۸۳ء

۵۴۰ **فیروز نگار** ۔ پہلے یہ گلدستہ شعر و سخن کا چھوٹے آٹھ ورق پر لکھنؤ سے صادق علی قیصر نے کھولا پور ضلع امراؤتی ملک برار مشرقی سے چھپوا کر یکم نومبر ۱۸۸۵ء کو جاری کیا اب... آگرہ سے باہتمام نثار علی۔

۵۴۱ **فیروز پور پنچ** ۔ فیروز پور، ہفتہ وار، ۴ ورق خورد...، مالک فیروزالدین...، ۲۴ اکتوبر ۱۸۸۶ء

۵۴۲ **قاسم الاخبار** ۔ بنگلور، ہفتہ وار، ۴ ورق کلاں..، مالک محمد قاسم علی تمنؔ..، جنوری ۱۸۶۱ء

۵۴۳ **قاصد** ۔ پٹنہ، ڈاکخانہ باقی پور محلہ رمنہ، ہفتہ وار، ۲ ورق اوسط..، مالک اقبال علی..، ۲ر جنوری ۱۸۸۸ء

۵۴۴ **قانون حکمت** ۔ لاہور...، ہفتہ وار، ۸ ورق... مالک حکیم سید عالم شاہ..، یکم مئی ۱۸۸۲ء

۵۴۵ **قانون معاہدہ کا رسالہ** :۔ دہلی، ماہواری... مالک مہتاب رائے وکیل..، یکم جولائی ۱۸۸۴ء

۵۴۶ **قیامت** : لکھنؤ..، ہفتہ وار، ۸ ورق اوسط... مالک خواجہ محمد وزیر، مہتمم خواجہ عاشق علی..، یکم جنوری ۱۸۸۵ء

۵۴۷ **قومی کایستھ نگم اوماپان** ۔ لکھنؤ...، ماہواری، ۸ ورق خورد..، مالک لالہ دیبی پرشاد..، یکم جنوری ۱۸۸۴ء

۵۴۸ **قیصر الاخبار** ۔ الہ آباد..، ہفتہ وار، ۶ ورق اوسط...، مالک سراج الدین احمد خاں..، یکم جنوری ۱۸۷۷ء

۵۴۹ قیصر الاخبار روزانہ، الہ آباد ... ، چھوٹے دو ورقوں پر ... یکم نومبر ۱۸۷۷ء

۵۵۰ قیصر الاخبار ۔ اوناؤ۔ ہفتہ وار، ۴ ورق خورد ... یکم جنوری ۱۸۸۷ء

۵۵۱ قیصری ۔ جالندھر، ہفتہ وار، ۶ ورق اوسط ... مالک محمد بخش ... ۱۸۸۴ء

۵۵۲ کاشی پترکا ۔ پہلے ۱۵ جنوری ۱۸۷۸ء کو ... پندرہ روزہ ناگری مشترک چھوٹے ۱۲ ورق پر ... باہتمام داماں نند ... ، جاری ... اب ہفتہ وار ... ، بنارس سے باہتمام پنڈت لکشمی شنکر (لچھمی شنکر) ام ۔ اے ۔ کے ... شائع ہوتا ہے :

۵۵۳ کاشف الحقیقت: کپورتھلہ، ماہواری، ۱۲ ورق خورد ... مہتمم ہری چند ... ، ایڈیٹر۔ رگھوبر داس بیدانتی، دوسرا نام اس رسالہ کا مذہبی ہو د کاست پر کاشک ہے ... یکم اگست ... ۱۸۸۵ء

۵۵۴ کارنامہ ۔ لکھنؤ ... ، ہفتہ وار، ۸ ورق اوسط ... مالک محمد یعقوب انصاری ... ، یکم جنوری ۱۸۶۵ء

۵۵۵ کانپور گزٹ ۔ کانپور، ہفتہ وار، ۸ ورق اوسط ... ، مالک منشی نولکشور، مہتمم بھیروں ناتھ مرحوم ... ، ایڈیٹر مولوی محمد اسمٰعیل ... ، یکم ستمبر ۱۸۶۵ء

۵۵۶ کالیستھ سماچار ۔ ... کالی پرشاد (متوفی) نے پندرہ روزہ چھوٹے ۶ ورق ... ، باہتمام لالہ گوکل پرشاد کالیستھ۔ لکھنؤ ... سے ۱۸۷۲ء کو جاری کیا بعدہٗ باہتمام شیخ محمد ... الہ آباد میں چھپا ... ، ایڈیٹر بلدیو پرشاد پرنٹر جیا دیو پرشاد

۵۵۷ کالیستھ ریفورم ایسوسی ایشن: آگرہ، ماہواری ۱۰ اوراق خورد۔ بابو ہرگوبند ناتھ سکریٹری، نرائن پرشاد جائنٹ سکریٹری یکم جنوری ۱۸۸۷ء

۵۵۸ کالیستھ اخبار ۔ ... لکھنؤ، ہفتہ وار، ۴ ورق اوسط ... ، حسب الارشاد بابو ہری رام صاحب وکیل ... مہتمم بھیارو دور پرشاد ... ، یکم اپریل ۱۸۸۸ء

۵۵۹ کتاب مسائل قانون: ۔ آگرہ، پندرہ روزہ ... مالک بیج ناتھ بی اے مصنف ... ، یکم جون ۱۸۸۵ء

۵۶۰ کیتھر پنچ ۔ بدایوں ... ، ۴ ورق خورد ... ، باجازت حکیم وارث علی خاں صاحب رئیس آنولہ، مہتمم علی امجد حسین، ایڈیٹر اشار عشری، یکم مئی ۱۸۸۳ء

۵۶۱ کرشمۂ دلبر ۔ خیرآباد ... ماہواری ۱۰ ورق خورد، شعر و سخن کا گلدستہ ... ، مالک سید افتخار حسین مضطر۔ مہتمم خواجہ محمد وزیر ۱۰ ستمبر ۱۸۸۴ء

۵۶۲ کڑا پنچ ۔ الہ آباد، ہفتہ وار، ۴ ورق اوسط ... ، مالک حافظ سید محمد اسمٰعیل کاتب فصیح اللہ ۔ ۴ فروری ۱۸۸۵ء

۵۶۳ کلکتہ پنچ ۔ کلکتہ، ماہواری ۴ ورق ... ، مالک دائم اللہ، مہتمم غلام سبحان خاں ... ، یکم جنوری ۱۸۷۱ء

۵۶۴ **کلید امید** ۔ لاہور، ہفتہ وار، ۸ ورق اوسط، مالک منشی محمد منیر، مہتمم جگت نرائن ... ۱۸۶۷ء

۵۶۵ **کلید امتحان مڈل اسکول وانٹرنس** : زیر نگرانی سکریٹری عبدالعزیز ... ماہواری، ۱۲ ورق خورد ۱۸۷۷ء میں یہ رسالہ جاری ہوا تھا۔ اب گوجرانوالہ۔ مہتمم منشی محبوب عالم۔

۵۶۶ **کلیدِ قوانین** ۔ لاہور ... ماہواری ۷ ... مجاریہ لالہ نرگی رام ... اشتہار جنوری ۱۸۸۳ء

۵۶۷ **کلیدِ جنت** ۔ لاہور ... ماہواری، ۱۲ ورق خورد کا گلدستہ نعتیہ ... مالک سردار علی اختر ... مہتمم گلزار بخش ... ۵/ اکتوبر ۱۸۸۵ء

۵۶۸ **کوئٹہ گزٹ** ۔ مدرراج، کوئٹہ، ہفتہ وار، مہتمم میر فتح اللہ شاہ ... یکم جنوری ۱۸۶۰ء

۵۶۹ **کوہِ نور** ۔ لاہور، ہفتہ میں دو بار، مالک رائے ہرسکھ رائے، مہتمم جگت نرائن ... ۱۸۷۵ء
ایک اور "کوہ نور" لاہور کا اشتہار دیا گیا ہے جو ہفتہ میں تین بار چھپتا تھا اور ۱۶ صفحات پر مشتمل تھا۔ ضمیمہ اختر شہنشاہی۔

۵۷۰ **کوہِ طور** : گوجرانوالہ، ترجمہ قرآن مجید و حدیث شریف اور عقائد اور اصول و فروغ علم طریقت کا ماہواری ۲ ورق اوسط ... مالک دیوان چند ... یکم دسمبر ۱۸۷۱ء

۵۷۱ **کوہِ طور** ۔ لاہور ... ہفتہ وار، ۴ ورق اوسط، مہتمم مرزا یعقوب بیگ ... یکم اپریل ۱۸۷۲ء

۵۷۲ **کوکب ہند** ۔ لکھنؤ ... پندرہ روزہ ورق اوسط ... مہتمم پادری ٹی کریون ... پہلے اس کا نام شمس الاخبار تھا ... ۱۸۶۹ء

۵۷۳ **کھتری ہتکاری** : آگرہ ... ماہواری مذہبی ۱۲ ورق کا رسالہ ... دینا ناتھ ٹنڈن ... یکم مئی ۱۸۸۷ء

۵۷۴ **کرناٹک پنچ** ۔ یہ ظریف پرچہ ... بطور ضمیمہ دبیر مدراس کے شائع ہو کر فرحت افزا ... ہوتا ہے ... عشرہ وار، ۴ ورق ... مہتمم محی الدین حسین خاں خویش ... یکم اپریل ۱۸۸۴ء

۵۷۵ **کیوریٹری** ۔ ناگپور ... مہتمم کیوریٹری سرکاری ... ۱۸۶۲ء

۵۷۶ **گلزارِ پنجاب** ۔ گوجرانوالہ، ہفتہ وار، ۷ ورق، مہتمم گندا مل ... ۱۸۵۰ء

۵۷۷ **گلزارِ خلد** ۔ قنوج ... ماہواری، ۹ ورق خورد ... مالک بھگو خاں رحیم ... مارچ ۱۸۸۵ء، گلدستہ جس میں نعتیہ غزلیں ... اور کچھ پند و نصائح درج ہیں۔

۵۷۸ **گلزارِ اودھ** ۔ سلطان پور ... ہفتہ وار، ۵ ورق اوسط ... مالک نروتم داس ... یکم جنوری ۱۸۸۸ء

۵۷۹ **گلزارِ حکمت** ۔ لاہور ... ماہواری، ۸ ورق خورد ... باماد و اعانت عبدالحکیم کلانوری ... محمد خلیل ... جولائی ۱۸۸۳ء

۵۸۰ **گلزارِ جہاں** ۔ کلکتہ ... ماہواری، ۸ ورق خورد. اس میں کھیل کے متعلق .. مضامین درج ہوں گے .. مالک امیر علی ... اشتہار ۳۱ر مارچ ۱۸۸۵ء

۵۸۱ **گلزار بہیرہ** ۔ بہیرہ، ضلع شاہ آباد... ایک ورق اوسط.. ضمیمہ دوست ہند. مالک بخشی رام سبھایا ۱۴ر جون ۱۸۸۷ء

۵۸۲ **گلزارِ سخن** ۔ حیدرآباد... ماہواری، ۱۴ ورق خورد، شعر وسخن کا گلدستہ... مالک نورالدین، مہتمم حاجی عبدالرحیم شرف ... یکم اکتوبر ۱۸۸۷ء

۵۸۳ **گلشنِ نوبہار** ۔ کلکتہ کا اخبار، نومبر ۱۸۵۷ء

۵۸۴ **گلشنِ کشمیر** ۔ لکھنؤ.. ماہواری، ۸ ورق اوسط.. مالک پنڈت دیبی پرشاد ... مارچ ۱۸۶۸ء

۵۸۵ **گلشنِ ریاضی** ۔ آگرہ .. ماہواری، ۲۲ ورق خورد.. مالک خواجہ یوسف علی وامیرالدین ... یکم جنوری ۱۸۸۳ء

۵۸۶ **گلشنِ بے خزاں** ۔ بنارس کا اخبار ۔ اشتہار جنوری ۱۸۸۷ء

۵۸۷ **گل بن سخن** ۔ میرٹھ ... پندرہ روزہ .. مالک برکت علی انداز و مہتمم چراغ الدین لائق لاہوری، ۱۵ر فروری ۱۸۸۵ء

۵۸۸ **گل وبلبل** ۔ حیدرآباد.. ماہواری، ۱۶ ورق خورد، شعر وسخن کا گلدستہ... مالک سید اسطف حسین قابل ۔ مہتمم سید محمد عباس مجور، ۱۱ر دسمبر ۱۸۸۷ء

۵۸۹ **گلدستہ شعرا** ۔ فتح گڑھ... ماہواری ... باہتمام شنکر سروپ نجات ... ۱۸۶۵ء

۵۹۰ **گلدستہ بدایوں** ۔ کچہری، تحصیل بدایوں، ماہواری، ۴ ورق اوسط، شعر وسخن کا گلدستہ ... مجاریہ چودہری سیدالدین حسین رئیس کھیڑہ .. یکم دسمبر ۱۸۷۴ء

۵۹۱ **گلدستہ شعرا** ۔ لکھنؤ... ماہواری، ۸ ورق خورد... مہتمم شیخ محمد تائب ... ۱۸۷۴ء

۵۹۲ **گلدستہ بنارس** ۔ بنارس، ہفتہ وار، ۲ ورق اوسط .. مہتمم کلیم الدین حسن و فدا حسین ... یکم جولائی ۱۸۸۲ء

۵۹۳ **گلدستہ انجمن** ۔ لاہور کا ماہواری گلدستہ، شعر وسخن کا رسالہ، ایڈیٹر سیف الحق دہلوی، یکم نومبر ۱۸۸۳ء

۵۹۴ **گلدستہ بہار** ۔ بہار، ضلع پٹنہ... گلدستہ شعر وسخن، ماہواری، ۲۴ ورق خورد، مالکان شیخ خرات حسین وسید عطا حسین ... ۲۷ر دسمبر ۱۸۸۳ء

۵۹۵ **گلدستہ مضامین** ۔ متھرا.. ماہواری، ۱۰ ورق خورد، مالک چودہری شیام لال ... ایڈیٹر گنگا پرشاد... مہتمم بانکے لال زار بدایونی ... یکم اپریل ۱۸۸۵ء

۵۹۶ **گلدستہ کلام** ۔ دہلی، شعر وسخن کا ماہواری رسالہ، مقام بستی نظام الدین ... مالک امیر سنگھ.. یکم اپریل ۱۸۸۶ء

۵۹۷ **گلدستہ تجارت** ۔ دہلی.. ماہواری، ۱۰ ورق خورد.. مالک حافظ بخش الہیٰ ... یکم جولائی ۱۸۸۵ء

۵۹۸ **گلدستہ سخن** ۔ لکھنؤ.. ماہواری، ۸ ورق خورد، شعر وسخن کا رسالہ.. مالک پورن چند، مہتمم رام سہائے تمنا.. ۲۴ر جولائی ۱۸۷۶ء

(باقی)

نئے خزانے

جنوری۔ جون ۶۷ء

مرتبہ

ابو سلمان شاہجہانپوری

انجمن ترقی اردو (پاکستان)
کراچی ۱

دسمبر ۶۶ء تک کے اُردو رسائل واخبارات کا اشاریہ شائع کیا جاچکا ہے۔
اس مرتبہ چھ ماہ کا اشاریہ ایک ساتھ ترتیب دیا گیا ہے اور یہ اس کی پہلی قسط ہے اس میں پچھلے دو برس کے بعض وہ رسائل بھی شامل ہیں جو اس سے پہلے دستیاب نہ ہوسکے تھے

اشاریے کی تیاری میں جن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اس کا اندازہ صرف انھیں حضرات کو ہوسکتا ہے جو اس قسم کے کاموں کا تجربہ رکھتے ہیں۔ رسائل کی فراہمی ایک بڑا مشکل کام ہے، اس کے لیے پوری کوشش کی جاتی ہے۔ پھر بھی بعض رسالے نظر سے نہیں گزرتے۔ مدیران کرام کو بار بار خطوط لکھے جاتے ہیں اور ــــ واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں ــــ کے مصداق وہ تعاون حاصل نہیں ہوتا جو اس قسم کے کاموں کے لئے ضروری ہے۔ ہم نے اپنے وسائل کی حد تک اس اشاریے کو ہر اعتبار سے جامع بنانے کی کوشش کی ہے۔ پھر بھی ممکن ہے بعض رسائل نظر انداز ہوگئے ہوں اور ان کے حوالے اس میں موجود نہ ہوں۔ ہم اپنے قارئین سے درخواست کرتے ہیں کہ اگر کوئی حوالہ اس اشاریے میں نہ ہو تو وہ ہماری رہنمائی فرمائیں تاکہ آئندہ اقساط میں اُسے شامل کرلیا جائے۔

(ادارہ)

موضوعات

رسائل و جرائد

جن کے مضامین اس اشاریے میں شامل ہیں

ماہنامہ آجکل دہلی جنوری و اپریل ۱۹۶۷ء
سہ ماہی اُردو کراچی جنوری تا اپریل ۱۹۶۷ء
" اردو ادب علی گڑھ نمبر ۳، ۴ ۱۹۶۶ء
ماہنامہ اُردو ڈائجسٹ لاہور جنوری، جون و نومبر ۱۹۶۵ء
اپریل تا اگست و نومبر ۱۹۶۶ء اور جنوری
مارچ تا جون ۱۹۶۷ء
" اردو زبان سرگودھا جنوری تا اپریل و جون ۱۹۶۷ء
سہ ماہی اردو نامہ کراچی مارچ ۱۹۶۷ء
ماہنامہ ادب لطیف لاہور جنوری و ستمبر تا دسمبر ۱۹۶۶ء
" ادبی دنیا " ستمبر و اکتوبر ۱۹۶۶ء
" افکار کراچی جنوری، فروری، مئی و جون ۱۹۶۷ء
سہ ماہی اقبال ریویو " جنوری و جولائی ۱۹۶۷ء
ماہنامہ ابلاغ بمبئی جنوری تا مارچ و مئی جون ۱۹۶۷ء
" الجامعہ محمدی شریف (جھنگ) مارچ تا مئی ۱۹۶۷ء
" الرحیم حیدرآباد دسمبر ۱۹۶۶ء تا جون ۱۹۶۷ء
— الزبیر بہاولپور نمبر ۱۰ ۱۹۶۶ء
ماہنامہ الشجاع کراچی فروری و اپریل تا جون ۱۹۶۷ء
سہ ماہی العلم " اکتوبر ۱۹۶۶ء تا مارچ ۱۹۶۷ء
ماہنامہ امام کراچی فروری ۱۹۶۷ء
" انجمن اسلامیہ میگزین کراچی جنوری، فروری و اپریل ۱۹۶۷ء
" انوار اسلام رام نگر (بنارس) فروری تا جون ۱۹۶۷ء
— اوراق لاہور جنوری ۱۹۶۷ء (سالنامہ) دسمبر ۱۹۶۶ء
— اورینٹل کالج میگزین لاہور اگست و نومبر ۱۹۶۶ء
ماہنامہ برہان دہلی جنوری تا جون ۱۹۶۷ء
سہ ماہی بصائر کراچی جنوری ۱۹۶۷ء

ماہنامہ بینات کراچی جنوری تا جون ۱۹۶۷ء
" پیام عمل لاہور جنوری و فروری ۱۹۶۷ء
" تجلی دیوبند جنوری تا مئی ۱۹۶۷ء
— تحریر دہلی جلد ۱ نمبر ۱ ۱۹۶۷ء
ماہنامہ تحریک " جنوری تا جون ۱۹۶۷ء
— تخیل لاہور ۱۹۶۵ء
ماہنامہ ترجمان القرآن " جنوری تا جون ۱۹۶۷ء
" تہذیب الاخلاق لاہور جنوری تا مارچ ۱۹۶۷ء
" ثقافت لاہور جنوری تا مئی ۱۹۶۷ء
" جامعہ دہلی جنوری تا جون ۱۹۶۷ء
" جام نو کراچی فروری تا مئی ۱۹۶۷ء
— جنرل آف دی ریسرچ سوسائٹی
آف پاکستان، پنجاب یونیورسٹی لاہور جنوری و اپریل ۱۹۶۵ء
ماہنامہ چراغ راہ کراچی جنوری تا جون ۱۹۶۷ء
" خاتون پاکستان " جنوری، غوث اعظم نمبر ۱۹۶۷ء
" خاتون دکن حیدرآباد دکن دسمبر ۱۹۶۶ء و جنوری و مارچ
تا مئی ۱۹۶۷ء
" رہنمائے تعلیم دہلی جون ۱۹۶۷ء
" زاویے حیدرآباد اپریل مئی ۱۹۶۷ء
" زندگی رام پور جنوری تا مارچ و مئی جون ۱۹۶۷ء
" ساقی کراچی جنوری، مارچ، اپریل ۱۹۶۷ء
" سب رس حیدرآباد دکن جنوری تا مئی ۱۹۶۷ء
— سندھ مسلم کالج میگزین کراچی اپریل ۱۹۶۶ء
ماہنامہ سیارہ لاہور جنوری تا جون ۱۹۶۷ء
" سیارہ ڈائجسٹ " فروری و مئی ۱۹۶۷ء

ماہنامہ شان ہند دہلی مارچ تا مئی ۱۹۶۶ء
" صبا حیدرآباد دکن اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۶ء
ماہنامہ صبح دہلی جنوری تا مارچ ۱۹۶۷ء
" صبح امید بمبئی مارچ تا جون ۱۹۶۷ء
— صحیفہ لاہور جنوری و اپریل ۱۹۶۷ء
ماہنامہ طلوع اسلام " جنوری تا جون ۱۹۶۷ء
" عارف " جنوری تا اپریل ۱۹۶۷ء
" عالمی ڈائجسٹ کراچی جنوری فروری و اپریل تا جون ۱۹۶۷ء
" عصمت " جنوری و مارچ اپریل ۱۹۶۷ء
" فاران " اپریل و نومبر ۱۹۶۶ء۔ جنوری تا مارچ و جون ۱۹۶۷ء
" فروغ اردو لکھنؤ جنوری تا مارچ اپریل و جون ۱۹۶۷ء
" فکر و خیال کراچی جنوری تا مارچ و مئی جون ۱۹۶۷ء
" فکر و نظر راولپنڈی اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۶ء
" فیض الاسلام لاہور جنوری فروری ۱۹۶۷ء
" قومی زبان کراچی جنوری تا جون ۱۹۶۷ء
— کامران سرگودھا جلد ۱۱ نمبر ۴
ماہنامہ کتاب لاہور جنوری تا جون ۱۹۶۷ء
" کتاب لکھنؤ جون ۱۹۶۷ء
" کتابی دنیا کراچی جنوری تا مئی ۱۹۶۷ء
— گفتگو بمبئی جنوری ۱۹۶۷ء
ماہنامہ ماہ نو کراچی نومبر ۱۹۶۶ء تا اپریل ۱۹۶۷ء و جون ۱۹۶۷ء
" مجلۃ الجامعہ ربوہ جنوری تا ستمبر ۱۹۶۵ء و اپریل تا دسمبر ۱۹۶۶ء
— مجلہ جامعہ اسلامیہ بہاولپور نمبر ۳ ۱۹۶۶ء
— محفل لاہور جنوری تا مارچ ۱۹۶۷ء
— محور " ۱۹۶۶ء
ماہنامہ معارف اعظم گڑھ جنوری تا جون ۱۹۶۷ء
" منشور کراچی فروری تا مارچ ۱۹۶۷ء
" میثاق لاہور جنوری تا جون ۱۹۶۷ء

— نصرت " دسمبر ۱۹۶۶ء، جنوری ۱۹۶۷ء، مئی جون ۱۹۶۷ء
ماہنامہ نقش کراچی جنوری تا اپریل ۱۹۶۷ء
— نقوش لاہور نمبر ۱۰۷ مئی ۱۹۶۷ء
ماہنامہ نگار پاکستان کراچی اپریل و نومبر ۱۹۶۵ء، اگست و دسمبر ۱۹۶۶ء
جنوری تا جون ۱۹۶۷ء
— نیا دور " نمبر ۳۹ تا ۴۲
ماہنامہ نیرنگ خیال لاہور فروری، مئی و جون ۱۹۶۷ء
" ہمایوں دہلی جنوری تا مئی ۱۹۶۷ء
" ہمدرد صحت کراچی فروری تا جون ۱۹۶۷ء و ۱۹۶۵ء ۱۹۶۶ء
کے متفرق شمارے
" ہندوستانی ادب حیدرآباد دکن جنوری، مارچ ۱۹۶۷ء

ہفت روزہ اور پندرہ روزہ رسالے

آئین	لاہور	سندھ انجام	کراچی
اخبار جہاں	کراچی	" امروز	لاہور
المنبر	لائل پور	" کوہستان	"
الہام	بہاولپور	" مشرق	"
ترقی اردو	حیدرآباد دکن	" شہاب	"
جہاں نما	لاہور	صحیفہ اہل حدیث	کراچی
چٹان	لاہور	صدق جدید	لکھنؤ
خبرنامہ طب	"	قندیل	لاہور
خدام الدین	"	لاہور	"
ساغر	کراچی	ہماری زبان	علی گڑھ

جنوری سے جون ۱۹۶۷ء تک کے جو رسائل و جرائد موصول نہیں ہوئے افسوس ہے وہ اس اشاریے میں شامل نہیں کیے جاسکے۔ امید ہے کہ مدیران گرامی یہ رسائل و جرائد ہمیں فراہم فرمادیں گے تاکہ آئندہ ان کے مضامین کو اشاریے میں شامل کیا جاسکے۔

ادب و زبان

اردو ادب

آذر بیابانی	پروفیسر حیدر علی سے ایک انٹرویو	سب رس ص ۲۶ تا ۳۰ جنوری ۶۷ء
آذر بیابانی	کاوش بدری سے انٹرویو	خاتون دکن دسمبر ۶۶ء جنوری ۶۷ء
آرتھر ملّر		
یش سروج (مترجم)	ادیب اور پڑھنے والے	ہمایوں، دہلی ص ۲۲۹ تا ۲۳۸ اپریل ۶۷ء
آلڈس ہکسلے	ادب اور جدید زندگی	فکر و خیال ص ۴۲ - ۴۴ نمبر ۶، ۷ ۶۷ء
آنند، ملک راج	جدید سوسائٹی میں ادیب کی ذمہ داریاں	گفتگو ص ۲۴۳ - ۲۴۴ جنوری ۶۷ء
اثر فاروقی	فراق — ایک منفرد رباعی گو	〃 ص ۴۰ تا ۴۴ مارچ ۶۷ء
احتشام احمد ندوی، سید	شہر کلکتہ ادبی آئینہ میں	سب رس ص ۳ تا ۱۳ اپریل ۶۷ء
احتشام احمد ندوی، ڈاکٹر	اکبر کی شاعری میں ہندوستانیت	〃 ص ۲۹ تا ۳۲ مئی ۶۷ء
احتشام احمد ندوی، سید	لکھنؤ اردو شاعری کے آئینے میں	سب رس ص ۱۴ تا ۲۴ فروری ۶۷ء
احتشام حسین، سید	ادیب کی انفرادیت اور عصری رجحانات	کتاب لکھنؤ ص ۵ تا ۷ جون ۶۷ء
〃	مصحفی کا ایک اور فارسی دیوان (جواب دیوان نظیری)	اردو کراچی ص ۵۷ تا ۷۰ اپریل ۶۷ء
〃	ناول کی تنقید	نگار پاکستان ص ۲۰ تا ۲۶ اپریل ۶۷ء
احراز نقوی، ڈاکٹر	نئی کہانی	ادب لطیف لاہور — جنوری ۶۶ء
احسن فاروقی، محمد	بے نقاب کیا۔ ناول اور زندگی کی ترجمانی	خاتون دکن ص ۴ تا ۱۲ اپریل مئی ۶۷ء
〃	تحقیق اور ٹکنیک	نقوش ص ۹۱ تا ۹۳ مئی ۶۷ء
احمد، محی الدین	صفی مرحوم کی بدیہہ گوئی	سب رس ص ۱۴ تا ۱۸ جنوری ۶۷ء
احمد رفاعی	ذوق کی قصیدہ نگاری	قومی زبان ص ۵۵ تا ۶۴ 〃
〃	فن سوانح نگاری پر ایک نظر	نگار پاکستان ص ۲۴ تا ۵۴ جنوری فروری ۶۷ء
اختر، عبداللطیف	سرشار اور لکھنؤ	نور ص ۳۴ - ۴۷ ۶۶ء
اختر حسین (صدر انجمن ترقی اردو)	بچوں کا ادب[1]	قومی زبان ص ۳ تا ۴ فروری ۶۷ء
ادیب، ڈاکٹر لطیف حسین	گلدستہ شکوۂ یار	〃 ص ۴۱ تا ۴۶ 〃
ادیب، سید مسعود حسن رضوی	اردو شاعری کی عظمت	ہمایوں ص ۲۴۳ تا ۲۴۷ اپریل ۶۷ء

---

[1] قومی مرکز کتاب کے جلسۂ تقسیم انعامات کا خطبۂ صدارت۔

ارشد، رشید احمد	مفتی کفایت اللہؒ کی نادر تحریر	بینات	ص ۴۹ تا ۵۴	اپریل سنہ ۶۷ء
اسحاق، محمد	فوائد فیروز شاہی	ثقافت	ص ۴۳ تا ۵۷	فروری سنہ ۶۷ء
اسلم، ایم	افسانہ اور ناول کا تصور	ساقی	ص ۳ تا ۸	اپریل سنہ ۶۷ء
"	ناول اور معاشرہ	ساقی	ص ۳ تا ۷	مئی جون سنہ ۶۷ء
اسلوب احمد انصاری	ادبی تاریخ اور ادبی تنقید	نقوش	ص ۵۵ تا ۶۲	مئی سنہ ۶۷ء
اشتیاق طالب	مجاز کی انفرادیت	الشجاع	ص ۱۲ تا ۱۵	اپریل سنہ ۶۷ء
اشرف، اے بی	"خدا کی بستی"	نگار پاکستان	ص ۵۷ تا ۶۵	مارچ سنہ ۶۵ء
" "	غلام الثقلین نقوی کی افسانہ نگاری	اوراق	ص ۱۷۵ تا ۱۸۲	جنوری سنہ ۶۷ء
اشفاق محمد خاں	جدید شاعری	جامعہ	ص ۱۲۳ تا ۱۳۵	مارچ سنہ ۶۷ء
اشک، محمد خلیل علی خاں				
عبادت بریلوی (مرتب)	گلنار جبین	اورینٹل کالج میگزین	ص ۱ تا ۶۰	اگست سنہ ۶۶ء
"	"		ص ۶۱ تا ۱۱۷	نومبر سنہ ۶۶ء
اصغر عباس	زبان گل سے حسن یار کی تفسیر	ہماری زبان	ص ۶ تا ۹	یکم جنوری سنہ ۶۷ء
اصغر علی انجنیر	کانٹ اور عقل محض کی تنقید	نگار پاکستان	ص ۵ تا ۱۲	اپریل سنہ ۶۷ء
اطہر نفیس	آیات جمال میری نظر میں (مجموعہ کلام ذہین شاہ تاجی)	"	ص ۹۱	مئی جون سنہ ۶۷ء
اظہر، غلام حسین	ادب میں صحافت کا رجحان	اردو زبان	ص ۱۹ تا ۲۰	جنوری سنہ ۶۷ء
" "	"	ساقی	ص ۳۸ تا ۳۹	مارچ سنہ ۶۷ء
" "	اردو شاعری کا مزاج	اردو زبان	ص ۱۱ تا ۱۴	مارچ اپریل سنہ ۶۷ء
اظہر قادری	اچھا شعر	جام نو	ص ۱۵ تا ۲۰	فروری سنہ ۶۷ء
اعتبار ساجد	گلزار تبسم	قندیل	ص ۱۰	۱۱، ۲۱ مئی سنہ ۶۷ء
اعجاز فاروقی [1]	سوال یہ ہے: (جدید نظم کا مسئلہ)	اوراق	ص ۹ - ۳۳	سنہ ۶۷ء
افتخار جالب	تحقیق و تنقید	ادب لطیف	ص ۱۵ تا ۳۰	خاص نمبر سنہ ۶۶ء

[1] اس بحث میں ان حضرات نے حصہ لیا:- احمد ندیم قاسمی، جمیل ملک، جیلانی کامران، سجاد باقر رضوی، انور سدید اور غلام حسین اظہر

افتخار حسین ، آغا	تحقیق و احتساب کیلئے ایک ضابطہ اخلاق کی ضرورت	نگار پاکستان	ص ۴۱ تا ۴۶	مارچ ۱۹۶۷ء
افضل امام پھلواروی ، خواجہ	زیب النسا اور دیوان مخفی	خاتون پاکستان	ص ۳۷ تا ۴۴	جنوری ۱۹۶۷ء
افضل ملک ، محمد	تربیہ کا تصور	اوراق	ص ۷۸ تا ۹۵	۱۹۶۷ء
اقبال منہاس	اُردو غزل اور جنس	اردو زبان	ص ۳۷ تا ۳۹	جون ۱۹۶۷ء
"	سید قاسم محمود کا فن	ادب لطیف	ص ۲۱۵ تا ۲۲۴	جنوری ۱۹۶۶ء
اکبر الدین صدیقی ، محمد	آصف جاہ اول و ثانی کی شعر و ادب کی سرپرستی	سب رس	ص ۱۲ تا ۱۵	جون ۱۹۶۷ء
اکبر حمیدی	داغ کی داستان وصل	ادبی دنیا	ص ۶۱ تا ۶۴	ستمبر اکتوبر ۱۹۶۶ء
اکرام ادیب	ادیب کا مقام اور منصب	ماہ نو	ص ۶۹ تا ۷۷	مارچ ۱۹۶۷ء
اکرام چغتائی ، محمد	ولی کا غیر مطبوعہ کلام	اردو	ص ۴۱ تا ۷۷	جنوری ۱۹۶۷ء
الطاف علی بریلوی ، سید	مولانا حالی نے نظم پڑھی	العلم	ص ۲۸ تا ۳۵	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۶ء
امام الدین ، مولانا ابو محمد	سہسرام کی ایک شعری صحبت	انوار اسلام	ص ۲۵ تا ۲۹	مارچ ۱۹۶۷ء
امۃ القدوس	غزل - اردو شاعری کی ایک اہم صنف	مجلۃ الجامعہ	ص ۹۳ تا ۱۰۲	اپریل تا جون ۱۹۶۵ء
امجد کندیانی	غزل تحقیق سے تحقیق تک	نگار پاکستان	ص ۵۹ تا ۶۴	مئی جون ۱۹۶۷ء
انجم اعظمی	ادب کی تعلیم	افکار	ص ۳۰ تا ۳۴	مارچ ۱۹۶۷ء
"	پاکستان میں اردو ناول[1]	افکار	ص ۸۳ تا ۹۱	جون ۱۹۶۷ء
انور سدید	اردو ادب کی فکری تحریکیں	اردو زبان	ص ۸ تا ۱۰	مارچ اپریل ۱۹۶۷ء
"	اردو ادب کی چند فکری تحریکیں	ماہ نو	ص ۱۴ تا ۲۰	جنوری ۱۹۶۷ء
انور صدیقی	پطرس بخاری بہ حیثیت مزاح نگار	نگار پاکستان	ص ۱۸ تا ۲۴	مارچ ۱۹۶۷ء
انیس امام	نئی شاعری اور نئے شاعر	صبح نو	ص ۲۲ تا ۲۴	جون ۱۹۶۷ء
ایاز خسروی	جاز (JAZ)	نیرنگ خیال	ص ۳۸ تا ۴۷	"
ایلیٹ ، ٹی ایس				
جمیل جالبی (مترجم)	ادب اور عصر جدید	نیا دور	ص ۸۲ تا ۹۲ نمبر ۳۹، ۴۰	۱۹۶۶ء

---

[1] اردو مجلس کی ماہانہ نشست میں انجم اعظمی کے مقالے "پاکستان میں اردو ناول" پر بحث۔ اس بحث میں ان حضرات نے حصہ لیا:۔ سید قمر ہاشمی، شاہد عشقی، آغا افتخار حسین، عتیق احمد، انجم اعظمی، لطیف اللہ، سحر انصاری، اشفاق نقوی، پروفیسر عبدالسلام، امان علی نقوی اور حبیب اللہ۔

ایلیٹ، ٹی ایس

جمیل جالبی (مترجم)	تنقید کا منصب	نیا دور	ص ۴۴ تا ۵۷ نمبر ۳۹، ۴۰ ۱۹۶۶ء
"	شاعری اور پروپیگنڈا	نیا دور	ص ۵۸ تا ۶۶ " " " "
"	صحافت اور ادب	"	ص ۹۳ تا ۹۶ " " "
بدرالدجی خاں	ادب، ادیب اور قومیت	تخیل	ص ۳۲ تا ۴۴ سنہ ۶۴ء
بسمل، راجندر نرائن	جگر بریلوی کی غزل	اردو ادب	ص ۱۲۵ تا ۱۲۸ سنہ ۶۶ء
بشارت علی قریشی، محمد	شاعری کا معاشرتی وظیفہ	انجمن اسلامیہ میگزین	ص ۱۱ تا ۱۵ مارچ سنہ ۶۷ء
"	عمرانیات اور ادب کا رشتہ	نگار پاکستان	ص ۲۷ تا ۳۶ اپریل سنہ ۶۷ء
بشر نواز	نئے شعر کا لہجہ	الشجاع۔ کراچی	ص ۴۶ تا ۵۱ جون سنہ ۶۷ء
بیدار، ڈاکٹر عابد رضا	مصحفی کا مطالعہ	تحریر	ص ۸۳ تا ۱۲۷ نمبر ۱ سنہ ۶۷ء
بیگم خورشید مرزا	تنقید بھی تخلیق ہے	ساقی	ص ۳ تا ۵ مارچ سنہ ۶۷ء
پرویز پروازی	ناول کے عناصر ترکیبی	اوراق	ص ۱۶۴ تا ۱۷۴ جنوری سنہ ۶۶ء
پروین عالم	تخلیق و تنقید	ساقی	ص ۴۳ تا ۴۵ "
تابش الوری، سید	ارمغان اوج	الزبیر	ص ۶۵ تا ۷۲ نمبر ۴ سنہ ۶۶ء
تاجور سامری	ادب، آرٹ اور زندگی	ہمایوں	ص ۲۱۵ تا ۲۲۲ اپریل سنہ ۱۹۶۷ء
تبسم، صوفی غلام مصطفیٰ	تعمیر ملک و ملت میں بچوں کے ادب کا حصّہ	اوراق	ص ۳۵ تا ۳۸ جنوری سنہ ۶۷ء
تحسین سروری	اردو ادب کے غیر ادبی ماخذ (چراغ دہلی)	قومی زبان	ص ۴۳ تا ۴۶ مارچ سنہ ۶۷ء
"	اردو ادب کے غیر ادبی ماخذ (تاریخ نوایط)	قومی زبان	ص ۳۹ تا ۴۲ مئی سنہ ۶۷ء
"	اردو ادب کے غیر ادبی ماخذ (مشاہیر کاکوری)	قومی زبان	ص ۳۷ تا ۴۴ جون سنہ ۶۷ء

تردولر

حسرت سہروردی (مترجم)	کرل	معارف	ص ۸۰ جنوری سنہ ۶۷ء
تنویر علوی، ڈاکٹر	کلام نصیر کے ماخذ	تحریر	ص ۱۴۵ تا ۱۶۰ نمبر ۱ سنہ ۶۶ء
توصیف علوی	اردو شاعری میں خار و گل	ہمایوں	ص ۱۸۳ تا ۲۰۸ مارچ سنہ ۶۷ء
جاوید اختر، سید	سب رس پر ایک نظر	قومی زبان	ص ۲۷ تا ۳۰ جون سنہ ۶۷ء
جاوید لاہوری	اسلوب کا مسئلہ	اوراق	ص ۱۸۳ تا ۱۹۳ جنوری سنہ ۶۷ء

جعفر رضا	عشق اسکول کی اصلاحی تحریک	نقوش	ص ۱۱۱ تا ۱۲۱ مئی سنہ ۶۷ء
جلیل قدوائی	مطائبات سالک	قومی زبان	ص ۳۵ تا ۴۴ جنوری سنہ ۶۷ء
جمیل جالبی	میراجی کو سمجھنے کے لیے	نیا دور	ص ۱۲ تا ۴۳ نمبر ۴۳، ۴۴ سنہ ۶۷ء
جمیل ملک	ادبی تحریکوں کا مسئلہ	افکار	ص ۳۲ تا ۴۳ جون سنہ ۶۷ء
جوہر، نربھے رام	اسلامی طرز تحقیق	سیارہ	ص ۳۷ تا ۴۲ "
"	انشائیہ نگاری کیا ہے؟	نگار پاکستان	ص ۶۵ تا ۶۹ اپریل سنہ ۶۷ء
"	حالی ایک نقاد	ساقی	ص ۵۶ تا ۵۷ مارچ سنہ ۶۷ء
حامی الدین خاں، پرویز محمد	۱۹۶۷ کا پہلا اور دوسرا علمی مذاکرہ	العلم	ص ۹ تا ۱۷ جنوری تا مارچ سنہ ۶۷ء
حبیب ہوشیارپوری	بزم فروغ ادب کا مشاعرہ	قندیل	ص ۱۴ ۱۸ جون سنہ ۶۷ء
حرمت الاکرام	کلکتہ ایک رباب	نگار پاکستان	ص ۷۹ مارچ سنہ ۶۷ء
حسرت کاسگنجوی	اردو ناول اور ترقی پسند تحریک	سب رس	ص ۲۵ تا ۳۲ فروری سنہ ۶۷ء
"	"خدا کی بستی" اور ناول کا فن	نگار پاکستان	ص ۵۷ تا ۶۲ اگست سنہ ۶۶ء
"	فیض اپنی شاعری کے آئینے میں	ساقی،	ص ۵۲ تا ۵۸ مئی جون سنہ ۶۷ء
"	ناول اور سماجی شعور	ماہ نو	ص ۱۳ تا ۱۷+۵۲ دسمبر سنہ ۶۶ء
"	ناول کا علمی و فکری پہلو	"	ص ۴۹ تا ۵۱+۶۲ مارچ سنہ ۶۷ء
"	"	نگار پاکستان	ص ۵۷ تا ۶۰ "
حسن پرویز، سید	ایرانی زبان	"	ص ۴۹ تا ۵۲ اپریل سنہ ۶۵ء
حسن اختر، پروفیسر ملک	تنقید اور تحقیق	ادب لطیف	ص ۲۵ تا ۳۲ خاص نمبر سنہ ۶۶ء
"	تنقید اور تخلیق	"	ص ۲۹ تا ۴۷ نومبر دسمبر سنہ ۶۶ء
حسنین، ڈاکٹر سید محمد	انشاپردازی	ساقی	ص ۵۸ تا ۶۱ مارچ سنہ ۶۷ء
حسینی، سید خواجہ	وجہی کا نظریۂ ادب	سب رس	ص ۲۰ تا ۹ جنوری سنہ ۶۷ء
خالد، انور محمود	احمد ندیم قاسمی سے ایک ملاقات	ادب لطیف	ص ۷۱ تا ۷۶ خاص نمبر سنہ ۶۶ء
خالدہ قریشی	غلام مصطفیٰ اور اس کا فن	ماہ نو	ص ۱۱۳ + ۱۱۱ مارچ سنہ ۶۷ء
خاور، عبداللہ	"نیمروز" میری نظر میں	نگار پاکستان	ص ۶۲ تا ۶۵ اپریل سنہ ۱۹۶۵ء
خلیق انجم، ڈاکٹر	ادبی اور متنی تنقید	ہمایوں	ص ۲۶ تا ۳۰ جنوری سنہ ۶۷ء

خلیل، محمد انور	تہذیبی قدریں اور زبان	فکر و خیال ص ۳۶ تا ۳۹ نمبر ۲،۳ سنہ ۶۷ء
خورشید، عبدالسلام	سالک اور ماجرائے عشق	نقوش ص ۹۴ تا ۱۱۰ مئی سنہ ۶۷ء
خیال امروہوی	اپنی شاعری کی آپ بیتی	چٹان لاہور ص ۹ تا ۱۰ ۵/ جون سنہ ۶۷ء
ذکاء الرحمن	آج کا ادب اور ادیب	ادب لطیف ص ۷ تا ۱۴ خاص نمبر سنہ ۶۶ء
راجیو سکینہ	قدیم چیک ادب اور آرٹ میں ہندوستانی موضوع	ہمایوں ص ۱۳۲ تا ۱۳۵ فروری سنہ ۶۷ء
ربیعہ فخری	ورائے فلسفہ چیزے دگر است	نیرنگ خیال ص ۱۳ تا ۱۷ جون سنہ ۶۷ء
رحمان مذنب	ہومر کا مطالعہ	کتاب لاہور ص ۴۹ تا ۵۴ " "
رشید بٹ	اردو ادب	نیرنگ خیال ص ۱۲ تا ۱۴ فروری سنہ ۶۷ء
رشید احمد صدیقی	طنز و مزاح کیا ہے؟	نگار پاکستان ص ۸ تا ۱۵ جنوری فروری سنہ ۶۷ء
"	ماضی کے دھندلکوں سے یادوں کا کارواں	" ص ۵۷ تا ۵۹ اپریل سنہ ۶۵ء
رضا خاں، انیس	آغاز جدید اردو شاعری	قندیل ص ۱۴ ۱۵/ جنوری سنہ ۶۷ء
رضا العابدین	اردو تنقید کا مستقبل اور محمد حسن فاروقی	صبح نو ص ۲۵ تا ۲۷ جون سنہ ۶۷ء
رضوی، جے ایچ	کتاب کا انتخاب ایک مسئلہ ہے	قندیل ص ۲۰ ۱۹/ فروری سنہ ۶۷ء
رضیہ ہاشمی	اردو شاعری کی تاریخ میں ولی کی حیثیت	تخیل ص ۴۲ تا ۴۴ سنہ ۱۹۶۷ء
رفعت، مبارز الدین	سمرسٹ مام اور حیدرآباد دکن	سب رس ص ۳ تا ۸ فروری سنہ ۶۷ء
رفعت سروش	نقوش ولی	ساقی ص ۳۵ تا ۴۲ جنوری سنہ ۶۷ء
زاہدہ ابوالحسن	فن تذکرہ نویسی	سب رس ص ۱۷ تا ۱۹ جون "
سبط حسن، سید	مرحوم حیدرآباد کی چند یادیں	عالمی ڈائجسٹ ص ۱۵۲ تا ۱۵۸ مارچ "
سجاد نقوی	اردو ادب کے بونے	اردو زبان ص ۱۵ تا ۱۶ مارچ اپریل سنہ ۶۷ء
سحر ابو محمد	کلیم الدین احمد کی شاعری اور اردو دنیا	ہماری زبان ص ۷ تا ۸ ۲۲/ جنوری سنہ ۶۷ء
سحر انصاری	اک الف بیش نہیں۔ رئیس امروہوی کی شاعری کا مطالعہ	نگار پاکستان ص ۶۹ تا ۷۴ مئی جون سنہ ۶۷ء
"	شیکسپیر اور طبی مسائل	ہمدرد صحت ص ۹۳ تا ۱۰۴ جون سنہ ۶۶ء
سحر یوسف زئی	خوش حال خٹک کی شاعری	ماہ نو ص ۱۰۲ تا ۱۰۵+۱۱۵ مارچ سنہ ۶۷ء
سخاوت مرزا، محمد	شاہ رفیع الدین قندھاری کا تذکرہ نوبہار	العلم ص ۱۸ ـ ۲۳ جنوری تا مارچ سنہ ۶۷ء
سرور، آل احمد	اثر صاحب کی یادیں	ہماری زبان ص ۱ تا ۲ ۱۵/ جون سنہ ۶۷ء

سروری، عبدالقادر	پنڈت سالک رام سالک کشمیری کی داستان جگت رب	نگار پاکستان، کراچی	ص ۶ تا ۱۰	مئی جون ۱۹۶۷ء
سعادت نظیر	میر کے غم کی نوعیت	"	ص ۴۰ تا ۴۴	مئی جون ۱۹۶۷ء
سعیدہ عروج	ممتاز حسن (سے ایک انٹرویو)	اخبار جہاں، کراچی	ص ۳۰	۲۴ مئی ۱۹۶۷ء
سلطان رشک	تخلیق و تنقید میں تعلق	نیرنگ خیال، لاہور	ص ۱۵ تا ۱۶	فروری ۱۹۶۷ء
سلطان شاہ رخ	بچوں کی کتابیں۔ مصنفین کی اہم ذمہ داری	کتابی دنیا	ص ۵ تا ۵	جنوری ۱۹۶۷ء
سلیم، قاضی	جدیدیت	کتاب لکھنؤ	ص ۶۵ تا ۶۸	جون ۱۹۶۷ء
سلیم احمد	جوش اور خدا	نیا دور	ص ۳۳۵ تا ۳۴۵	۱۹۶۷ء
سلیم اختر	ادب اور حسن زبان	ماہ نو	ص ۱۵ تا ۲۱ + ۴۴	نومبر ۱۹۶۶ء
"	ادب، تخلیقی محرکات اور تخلیقی عمل	نگار پاکستان	ص ۳۸ تا ۴۱	جنوری فروری ۱۹۶۷ء
سلیمان حسین، ڈاکٹر سید	مثنوی عالم خیال کا تنقیدی جائزہ	صبح نو	ص ۹ تا ۱۲	جون ۱۹۶۷ء
سہیل بخاری، ڈاکٹر	اردو کا قدیم ترین ادب	صحیفہ	ص ۹ تا ۳۳	اپریل "
"	سب رس کی زبان	اردو زبان	ص ۱۳ تا ۱۸	جنوری ۱۹۶۷ء
"	سیرامپور، فورٹ ولیم کالج، اور باغ و بہار	"	ص ۵ تا ۷	مارچ اپریل ۱۹۶۷ء
سید، قاسم حسن	بھوپال کی ادبی خدمات کا (ایک جائزہ)	العلم	ص ۱۳ تا ۲۷	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۶ء
شاد، نریش کمار	میری غزلیہ شاعری	خاتون دکن	ص ۱۶ تا ۱۹	اپریل مئی ۱۹۶۷ء
شاعر قزلباش، آغا	بزم داغ کے چشم دید نقوش	نگار پاکستان	ص ۴۱ تا ۵۵	نومبر ۱۹۶۶ء
شانتی رنجن بھٹاچاریہ	بنگال میں اردو	قومی زبان	ص ۵۷ تا ۶۸	فروری ۱۹۶۶ء
شاہدہ بیگم برنی	شباب لکھنوی اور ان کی تخلیقات	محفل	ص ۷۷ تا ۸۳	مارچ ۱۹۶۷ء
شاہین، افتخار اجمل	محمد حسین آزاد کی انشا پردازی	ساقی	ص ۳۴ تا ۳۷	"
شفقت حسین	اسلوب کا مسئلہ	اوراق	ص ۷۱ تا ۷۷	"
شکیل احمد، محمد	سلطان المشائخ نظام الدین اولیا کا شعری و ادبی ذوق	معارف	ص ۱۵۰ تا ۱۵۶	فروری ۱۹۶۷ء
"	عشقیہ شاعری اور جگر مراد آبادی	قومی زبان	ص ۳۵ تا ۴۰	اپریل ۱۹۶۶ء
شمس لکھنوی، سید محمد باقر	دہلی میں اردو	نگار پاکستان	ص ۱۳ تا ۱۹	اپریل ۱۹۶۵ء
"	ماہر القادری کا مجموعۂ نعت	"	ص ۵۷ تا ۶۴	فروری ۱۹۶۵ء
شمیم احمد	تنقید کی کھڑاؤں	نیا دور	ص ۳۴۶ تا ۳۶۱	۱۹۶۷ء
شہاب، مسعود حسن	اردو زبان پر عربی کے اثرات	الزبیر	ص ۲۵ تا ۳۴	نمبر ۱، ۱۹۶۶ء

شہزاد منظر	شاعری کا مستقبل	کامران ص ۶ تا ۱۰ نمبر ۴ سنہ ۶۷ء
"	"	نگار پاکستان ص ۳۲ تا ۳۶ اپریل سنہ ۶۷ء
شیدا، راجیندر ناتھ	مخدوم کی نظمیں	قومی زبان ص ۴۱ تا ۵۶ "
صالحہ عابد حسین	غزل کی آپ بیتی	جامعہ ص ۷۵ تا ۸۵ فروری سنہ ۶۷ء
صفدر ادیب	مقالات حافظ محمود شیرانی	کتاب لاہور ص ۱۷ تا ۲۱ فروری سنہ ۶۷ء
صفدر حسین، ڈاکٹر	لکھنؤ کی خدمات زبان	نگار پاکستان ص ۸ تا ۱۱ جنوری سنہ ۶۵ء
صفدر علی بیگ، ڈاکٹر مرزا	فوق البشر	سب رس ص ۹ تا ۱۳ فروری سنہ ۶۷ء
طالب دہلوی	دلی کی شاعری	رہنمائے تعلیم ص ۱۳ تا ۱۴ جون سنہ ۶۷ء
طالب کاشمیری، پروفیسر	مثنوی عالم خیال	فروغ اردو ص ۲۵ تا ۲۹ جنوری سنہ ۶۷ء
" "	" "	" ص ۲۲ تا ۳۰ مارچ "
" "	" " (۴)	" ص ۲۸ تا ۳۱ اپریل "
طالوت، عبدالرشید	خواجہ فرید کا اردو کلام	الزبیر ص ۷۴ تا ۷۶ نمبر ۱ سنہ ۶۶ء
طاہر، تاراچرن رستوگی	منور لکھنوی کی غزلیہ شاعری	شان ہند ص ۱۰ تا ۱۹ مئی سنہ ۶۷ء
طیب انصاری	محمد حسین آزاد کا اسلوب	فروغ اردو ص ۱۲ - ۱۷ جون سنہ ۶۷ء
طیب انصاری، ملک زادہ	مسائل ادب	سب رس ص ۲۳ تا ۲۷ مارچ سنہ ۶۷ء
طیب بخش، محمد	عصر بنی امیہ میں غزل	بصائر ص ۴ تا ۲۰ جنوری سنہ ۶۷ء
ظ - انصاری	شاد عارفی کی شاعری اور شخصیت	نگار پاکستان ص ۱۷ تا ۲۱ فروری سنہ ۶۶ء
ظفر، منظفر احمد	سیف الملوک (حضرت میاں محمد بخش)	ماہ نو ص ۱۰۶ تا ۱۰۸ + ۱۲۰ مارچ سنہ ۶۷ء
ظہیر صدیقی، ڈاکٹر	قومی یکجہتی اور اردو شاعری	ہمایوں ص ۳۲۶ تا ۳۳۱ مئی سنہ ۶۶ء
عابدی، ڈاکٹر امیر حسن	نوعی جنوشانی	معارف ص ۴۴۹ تا ۴۶۳ جون سنہ ۶۶ء
عباد اللہ فاروقی، خواجہ	کلام ریختی کا موجد	ماہ نو ص ۲۱ تا ۲۷ + ۵۴ دسمبر سنہ ۶۶ء
عبدالاحد	اردو سے قبل ہندوستان کا تہذیبی اور لسانی جائزہ	سب رس ص ۸ تا ۱۹ مارچ سنہ ۶۶ء
عبدالسلام، پروفیسر	"خورشید بہو" کا قضیہ[۱]	نگار پاکستان ص ۳۰ تا ۳۱ اپریل سنہ ۶۷ء

---

[۱] مرزا محمد ہادی رسوا سے منسوب ایک ناول

عبدالعزیز، ڈاکٹر محمد	ابن النفیس میری نظر میں	ہمدرد صحت	ص ۷ تا ۱۴	اکتوبر ۱۹۶۵ء
عبداللہ، ڈاکٹر سید	میکدے میں میرؔ	ادب لطیف	ص ۲۳ تا ۳۴	جنوری ۱۹۶۶ء
"	نقطۂ نظر (تنقید میں)	نیا دور	ص ۲۴۲ تا ۲۷۰	۱۹۶۷ء
"	ہروسفے دخترے![1]	چٹان	ص ۱۱ + ۲۳	۵ جون ۱۹۶۷ء
عبدالمغنی	اسلامی ادب	چراغ راہ	ص ۲۷ تا ۳۷	اپریل ۱۹۶۷ء
عرش صدیقی	میرزا ادیب کی داستانیں	اوراق	ص ۴۸ تا ۷۰	نمبر ۲ ۱۹۶۷ء
عرش ملسیانی	رباعی اور محروم (تلوک چند)	آج کل	ص ۵ تا ۱۱	جنوری ۱۹۶۷ء
عرشی، امتیاز علی خاں	محسن کا ترجمۂ مخزن نکات	اردو	ص ۵ تا ۱۰	اپریل ۱۹۶۷ء
عرش ملیح آبادی، محمد علی	اردو نظم - عہد اورنگ زیب میں	لاہور[2]	ص ۱۰ تا ۱۱ + ۱۴	۱۶ جنوری ۱۹۶۷ء
علمی قطب	اردو غزل کی روایت سے سائل کا استفادہ	محفل	ص ۲۸ تا ۳۶	مارچ ۱۹۶۷ء
عظیم الشان صدیقی	فسانۂ آزاد کی کہانی	نقوش	ص ۱۳۳ تا ۱۳۶	مئی ۱۹۶۷ء
عظیم الشان صدیقی	فسانۂ لطائف یار یا سیر کہسار	نگار پاکستان	ص ۱۲ تا ۱۹	جنوری فروری ۱۹۶۷ء
عقیل، ڈاکٹر سید محمد	تحقیق اور مواد کی فراہمی کا مسئلہ	نقوش	ص ۶۳ تا ۷۵	مئی ۱۹۶۷ء
علی احمد	پاکستان میں ڈرامے کی روایات اور قومی تھیٹر کے مسائل	منشور	ص ۱۹ تا ۲۲	فروری ۱۹۶۷ء
علی جواد زیدی	اردو ادب کی تاریخ	نگار پاکستان	ص ۳۶ تا ۴۹	اگست ۱۹۶۶ء
علیم اختر مظفر نگری	نوازشات جگر	ساقی	ص ۷ تا ۱۶	مارچ ۱۹۶۷ء
عمر علوی	قومی ادب کا مسئلہ	ادب لطیف	ص ۴۷ تا ۵۶	خاص نمبر ۱۹۶۶ء
عمیق حنفی	سانکھیہ درشن	اوراق	ص ۱۲۳ تا ۱۲۹	جنوری ۱۹۶۷ء
عندلیب شادانی	کچھ مشاعروں کے بارے میں	محفل	ص ۱۱ تا ۱۴	جنوری فروری ۱۹۶۷ء
غلام السیدین، خواجہ	شعر حسن صداقت اور انسانیت کا ترجمان ہے	نگار پاکستان	ص ۵۳ تا ۵۶	مارچ ۱۹۶۵ء
غلام حیدر کاشمیری	انیس کی رزمیہ شاعری	تہذیب الاخلاق	ص ۴۸ تا ۵۷	جنوری تا مارچ ۱۹۶۷ء
غلام سمنانی، سید	ادب میں انسان دوستی	جامعہ	ص ۳۳ تا ۳۸	جنوری ۱۹۶۷ء
"	ادب میں انسان دوستی	ساقی	ص ۲۳ تا ۲۵	مارچ ۱۹۶۷ء

[1] "شاعری اور تخیل" (ہادی حسین) اور حمید نظامی اور میاں افتخار الدین" (شورش کاشمیری) کی تصانیف کا تعارف

[2] منقول از - قومی زبان

غوری، شبیر احمد خاں	اسلامی ہندوستان کا ابتدائی علمی دور	ثقافت	ص ۱۷ تا ۳۸	مارچ سنہ ۱۹۶۷ء
غیرت ادیب، کنھیا لال بھٹناگر	مرقع عروض (۶)	رہنمائے تعلیم	ص ۲۲ تا ۲۴	جون سنہ ۶۷ء
فاطمی، سید قدرۃ اللہ	رزم و نظم (ایک شعری مجموعہ) چند تاثرات	نصرت	ص ۹۵ تا ۱۰۲	دسمبر سنہ ۶۶ جنوری سنہ ۶۷ء
فراق گورکھپوری	شعر اور شاعر	ہندوستانی ادب	ص ۴ تا ۷	جنوری سنہ ۶۷ء
زمان فتح پوری	رزمیہ بحر اور سحر البیان	نگار پاکستان	ص ۴۹ تا ۵۲	مارچ سنہ ۶۵ء
فرید جعفری	قومیت اور جنگ	عالمی ڈائجسٹ	ص ۷۰ تا ۷۷	مئی سنہ ۶۷ء
فضیل جعفری	چٹان اور پانی	نقوش	ص ۱۲۰ تا ۱۴۷	۲،۳ / ۱۹۶۷ء
فہمیدہ قریشی	اردو شاعری اور صنف نازک	خاتون پاکستان	ص ۴۵ تا ۵۲	جنوری سنہ ۶۷ء
قاسمی، احمد ندیم	افریشیائی ادب کا مطالعہ	امروز	ص ۹	۲ مئی سنہ ۶۷ء
"	افریشیائی ادیبوں کے لئے لمحہ فکریہ	"	ص ۱۱	۱۸ جون سنہ ۶۷ء
"	چند جدید افریقی نظمیں (ترجمہ)	"	ص ۱۱	۱۱ جون سنہ ۶۷ء
"	درد آئے گا دبے پاؤں (ذکاء الرحمٰن کے افسانوں پر اظہار خیال)	کتاب لاہور	ص ۴۱ تا ۴۴	اپریل مئی سنہ ۶۷ء
"	کیا شعر و شاعری کا کوئی فائدہ بھی ہے؟	امروز	ص ۷	۲۸ مئی سنہ ۶۷ء
"	ہمارے افسانوں کے موضوعات محدود کیوں ہیں؟	"	ص ۱۱	۲۵ جون سنہ ۶۷ء
"	ہندوستان کے ارباب علم و فن کے نام	سیارہ	ص ۳۱ تا ۳۴	مارچ سنہ ۶۷ء
قدرت نقوی	اردو زبان کے چند محاورے۔ (سہیل بخاری کے مضمون پر ایک نظر)	ماہ نو	ص ۳۳ - ۴۰	جون سنہ ۶۷ء
قدسی، عبید اللہ	ہماری قومی شاعری	فاران	ص ۲۶ تا ۳۳	اپریل سنہ ۶۶ء
قریشی، الطاف حسن	جسٹس انوار الحق (سے انٹرویو)	اردو ڈائجسٹ	ص ۲۳ تا ۲۹	اپریل سنہ ۶۵ء
قمر احسن اعظمی	میر کی غزل میں واعظ کا مقام	فروغ اردو	ص ۴ تا ۷	مارچ سنہ ۶۷ء
قمر رئیس، ڈاکٹر	اردو نظم کا سفر	ہمایوں	ص ۱۲۷ تا ۱۳۱	فروری سنہ ۶۶ء
"	شاعری اور فارسی کا رشتہ	ہماری زبان	ص ۳ تا ۴	۱۵ جنوری سنہ ۶۷ء
قیصر عشرت	مومن اور غالب کے مبالغہ آمیز اشعار	نگار پاکستان	ص ۶۹ تا ۷۴	جنوری فروری سنہ ۶۷ء

قیوم نظر	احمد فراز کا سفر عشق	اوراق	ص ۴۳ تا ۴۷	نمبر ۲ سنہ ۶۷ء
”	ادب ایک دور آزمائش میں	سیارہ	ص ۳۵ تا ۳۷	مارچ سنہ ۱۹۶۷ء
کرامت، پروفیسر کرامت علی	نظم، نثر اور شعر	تحریک	ص ۵ تا ۷	جنوری سنہ ۶۷ء
”	مومن کا ایک شعر	ہماری زبان	ص ۳ تا ۴	یکم جنوری سنہ ۶۷ء
کرشن چندر	گنگا بہے نہ رات	سب رس	ص ۷ تا ۱۳	مارچ سنہ ۶۷ء
”	ہاتھی دانت کا ٹاور	نقش	ص ۱۵۷ تا ۱۵۹	۳/۴ ۱۹۶۷ء
کسری منہاس	آئین وفا (ڈاکٹر سید صفدر حسین کے مرثیے پر ایک نظر)	ادب لطیف	ص ۶۵ تا ۶۸	نومبر دسمبر سنہ ۶۶ء
”	تاریخ گوئی کی تاریخ	صحیفہ	ص ۴۴ تا ۵۸	اپریل سنہ ۶۷ء
”	طنز بدیہہ	ادب لطیف	ص ۲۱ تا ۴۴	خاص نمبر سنہ ۶۶ء
کشفی، ابوالخیر	ذکر اللہ اور انشائیہ	تخیل	ص ۲۵ تا ۲۹	سنہ ۶۷ء
گلزار وفا چودھری	نئی شاعری کے شریر بچے	محور	ص ۴۸ تا ۵۳	سنہ ۶۶ء
گوپال متل	ترقی پسند ادیبوں کی کانفرنس میں چینی سوویت کشمکش کا مظاہرہ	تحریک	ص ۵ تا ۶	مارچ سنہ ۶۷ء
گوہر نوشاہی	اردوئے معلی کا میر سوز نمبر	قومی زبان	ص ۴۷ تا ۵۲	”
”	حلوائے بے دود (محمد حسین محمود دہلوی کی ایک مثنوی)	کتاب	ص ۴۹ - ۵۵	اپریل مئی سنہ ۶۷ء
”	زبدۃ الاخبار۔ حکیم قدرت قاسم کی ایک گمنام مثنوی	”	ص ۳۳ تا ۳۷	مارچ سنہ ۶۷ء
”	قدرت کلام اور ندرت بیان کی شاعری (ظفر اقبال کی شاعری پر ایک تبصرہ)	ادب لطیف	ص ۳۳ تا ۳۸	خاص نمبر سنہ ۶۶ء
گیتی آرا	مکتوب نگاری کی روایت	افکار	ص ۲۹ تا ۳۳	فروری سنہ ۶۷ء
لطیف حسین ڈاکٹر	روہیلوں کے دور میں اردو شاعری	خاتون پاکستان	ص ۵۳ تا ۶۲	جنوری سنہ ۶۷ء
مالک رام	اردو میں تحقیق	قومی زبان	ص ۱۵ تا ۳۳	”
”	”	تحریک	ص ۱۱ تا ۲۲	فروری سنہ ۶۷ء
مانی بریلوی مختار احمد	واسوخت امانت	العلم	ص ۲۴ تا ۴۳	جنوری تا مارچ سنہ ۶۷ء
ماہر القادری	قول فیصل۔ سید علی اختر اختر کی ایک شاہکار نظم	فاران	ص ۲۲ تا ۳۷	جنوری سنہ ۶۷ء
مجتبیٰ حسین	سیرت کی ایک کتاب	افکار	ص ۲۷ تا ۲۹	مارچ سنہ ۶۷ء

(باقی)